طنز و مزاح

خس و خاشاک

هاشم عظیم آبادی

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی پٹنہ کا مالی تعاون شامل ہے

● کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں

● کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مصنف ذمہ دار ہے

مصنف ———— ہاشم عظیم آبادی

تعداد ———— ایک ہزار

صفحات ———— ۱۳۶

سال اشاعت ———— ۱۹۹۹ء

ناشر ———— ہاشم عظیم آبادی

خوش نویس ———— محمد عالمگیر سبحانپور، گلزار

مہتمم ———— سلطان آزاد

مصنف کا پتہ ———— تیری پولیا عالم گنج، پتھری گھاٹ پٹنہ ۷

قیمت ———— سو روپے Rs. 100/-

با اختیار کل تقسیم کار

مکتبہ آزاد نیو لین گلزار باغ پٹنہ ۷

انتساب

اپنے خرد سال پوتے شارق، طارق اور
اشعؔر کے نام جو مجھے دادا نہ کہہ کر ابّا کہتے ہیں
کیوں کہ اُن کی سمجھ کے مطابق دادا کے چہرے
پر داڑھی ہونی چاہیے جب کہ میں فیشن کے
انتظام صفائی پر عمل ہوں ۔

ہاشم عظیم آبادی

فہرست مضامین

کچھ اپنی تخلیقات اور دانشوروں کی آرا سے متعلق

میری ولادت ۳۲ء میں شہر عظیم آباد پٹنہ میں ایک معزز سید گھرانے میں ہوئی تعلیم و تربیت والد محترم سید نظیر حسن (مرحوم) کی زیر نگرانی پرانے ڈھنگ پر ہوئی۔ گھر ہی پر اُردو فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم کے بعد میرا داخلہ اسکول میں کرایا گیا۔ میرے معلم جناب تلطف حسین مرحوم بڑے زندہ دل شخص تھے بات بات پر چٹکلے اور ہنسی مذاق ان کی عادت ثانیہ تھی۔ انھیں کے مزاحیہ اشعار اور طنز آمیز باتیں کان میں پڑتی رہنے کے باعث میرے اندر بھی طنز و مزاح اور شعر و شاعری کے جراثیم پرورش پلتے رہے۔

میری سب سے پہلی نظم اپیل ۳۸ء میں پٹنہ کے سہ روزہ اخبار اتحاد میں شائع ہوئی جسے جناب سلطان احمد مرحوم نکالا کرتے تھے۔ نثر میں "چچا" کے مضحک پہلوؤں پر مزاحیہ خاکے پیش کرنے کا سلسلہ میں نے ۵۲ء سے شروع کیا جو ایک دلچسپ اور مرغوب فیچر کے طور پر برسوں اخبار اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اُن مضامین کے پندرہ خاکوں کا ایک مختصر انتخاب بہ عنوان "چچا" کتابچہ کی شکل میں ۶۲ء میں طبع ہوا اس وقت جناب ذاکر حسین (مرحوم) بہار کے گورنر تھے اس کتابچہ کے مطالعے کے بعد صاحب موصوف نے اپنے دست خاص سے مندرجہ ذیل سطور لکھ کر میری عزت افزائی فرمائی تھی۔

BIHAR GOVERNOR CAMP

یکم مئی ۶۲ء

مکرمی ہاشم صاحب تسلیم

آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ کوئی ساڑھے تین مہینہ کے بعد آپ کی کتاب "چچا" کی

رسید بھیج رہا ہوں ۔ دیر کرنے میں نیت بخیر تھی ۔ سوچا کہ کتاب پڑھ لوں تو رسید بھیجوں اسی میں دیر ہوگئی ۔ کتاب مختصر سی ہے کاغذوں میں دب گئی ۔ پھر اور کاموں میں مبتلا ہو گیا ۔ اب اسے پڑھنے کی نوبت آئی ہے بہت خوب ہے ۔ میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں ۔ اور خوش کہ وقت باخوش کر دی ۔

میری دوسری شعری تخلیق کا نقرتیں ؁۶۳ء میں منظر عالم پر آئی جس کے سارے خاکے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے پھر غالب کی زمین میں مزاحیہ اور طنزیہ اشعار کا ایک دیوان بعنوان انداز بیاں اور" بہار اردو اکیڈمی کی مالی تعاون سے ؁۸۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا اور انعام سے بھی نوازا گیا ۔

انداز بیاں اور" کا مسودہ ملاحظہ فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اس وقت صدر جمہوریہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے ایک خط میں مندرجہ ذیل تاثرات سے نوازا تھا افسوس کہ کتاب صاحب موصوف کے دور حیات میں نہ چھپ سکی ۔

RASHTRA PATI BHAWAN

NEW DELHI

مورخہ ۱۳ ستمبر سن ؁۶۰ء

مکرمی تسلیم .

نوازش نامہ ملا ۔ اور ساتھ ہی مزاحیہ دیوان غالب کا مسودہ بھی ۔ اور آپ کی شائع شدہ نظموں کا مجموعہ بھی ۔ ان سب کے لئے دلی شکریہ قبول فرمائیں ۔

غالب کی زمین میں مزاحیہ اور طنزیہ اشعار کا یہ دیوان یقیناً ادبی دنیا کے لئے ایک انوکھا تحفہ ہوگا ۔ گو کہ میں شعر و شاعری کے معاملہ میں اپنے کو رائے دینے کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی یہ کوشش بہت کامیاب ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ مزاحیہ کلام مقبولیت حاصل کرے گا ۔

مخلص

ذاکر حسین

"انداز بیاں اور" کے متعلق احمد جمال پاشا مرحوم کے تاثرات۔

دیوان غالب کی پیروڈی ہاشم عظیم آبادی کا ایک اہم یادگار کارنامہ ہے۔ انداز بیاں اور کا میں نے نہایت دلچسپی اور گہرائی سے مطالعہ کیا جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انداز بیاں اور غالبیات کے باب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

غالب نے اپنے زمانہ کو اپنے مسائل کی عینک سے دیکھا تھا اور ہاشم عظیم آبادی نے غالب کو اس زمانہ کے چشمہ سے دیکھا ہے۔ اس دورنگی نے طنز و مزاح کی جو خوشگوار کیفیت پیدا کر دی ہے وہ اردو پیروڈی کے باب میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ مزاحیہ شاعری اور تحریف کی تاریخ میں ہاشم عظیم آبادی کو زندہ رکھے گا۔

انداز بیاں اور پڑھ کر شاہ قتیل دانا پوری نے ایک خط تحریر کیا تھا جس کا اقتباس درج ذیل ہے....

...... اب تک جتنے مزاحیہ دیوان بہار میں چھپے ہیں وہ ایک طرف اور آپ کا یہ انداز بیاں اور ایک طرف تو اسی کا پلہ زیادہ بھاری رہے گا۔ بلکہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ دیوان اپنے رنگ کا واحد اور منفرد ہے...... بار بار پڑھتا ہوں اور سیری نہیں ہوتی مزاحیہ اور طنزیہ دیوان ہزاروں ہوں گے۔ مگر آپ کے دیوان کو نہیں پا سکتے۔ اس لئے کہ یہ ایک عجیب چیز ہو گئی ہے۔ ورنہ یہ بھی عام دیوان کی طرح ہو کر رہ جاتا۔ یہ سہرا آپ ہی کیلئے تھا۔ اور آپ ہی کے سر صرف آپ ہی کے سر چڑھا۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مشہور ناقد پروفیسر عبدالمغنی نے بھی میری مزاحیہ تخلیق چچا اور انداز بیاں اور پر ایک تبصرہ سپرد قلم فرمایا۔ بہ عنوان۔

انداز بیاں اور سے چچا تک

جناب ہاشم عظیم آبادی کافی عرصہ سے مزاح کے گل بوٹے نظم و نثر دونوں میں

کھلا رہے ہیں۔ انداز بیاں اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے غالب کی غزلیات کی زمین میں مزاحیہ تصرفات کا ایک گلزار ہے، اس تسلسل کے ساتھ غالب کی اتنی ساری غزلوں کے اشعار کی نظمیں کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی ہے۔ حالی نے جو غالب کو حیوان ناطق کہا ہے وہ جس معنی میں ہو لیکن ہاشم عظیم آبادی نے واقعی کلام غالب کے شعلوں سے ظرافت کی شمعیں روشن کی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں انھوں نے ۲۳۷ اشعار غالب پر گرہ لگا کر اتنی ہی غزلیں اپنے مخصوص پر مذاق انداز میں کہی ہیں۔ ان غزلوں میں شاعر نے عہد حاضر کے مسائل پر دلچسپ تبصرے کئے ہیں۔ ہاشم کے ان ظریفانہ اشعار کو پڑھ کر کبھی تبسم اور کبھی قہقہے کی پھول جھڑی چھوٹتی ہے ان میں شوخی بھی ہے۔ گستاخی اور تفریح بھی غالب کی مشہور غزل کے مطلع نکتہ چیں ہے .... کے تعاقب میں جو غزل کہی گئی ہے اس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا کہیں ایسی ہے کمزور بصارت اپنی!
نہ اشارے سے بلائے کبھی تو جائے تپنے

یہ بھی قسمت کی سیاہی کہ لیلٰے اپنی
اتنی کالی ہے کہ کاجل بھی لگائے نہ بنے

مزاحیہ خاکے چچا کے بارے میں عبدالمغنی صاحب آگے لکھتے ہیں۔ چچا مزاحیہ خاکوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ایک ہی کردار کی مفروضہ شخصیت کے تو یہ تو جلوے پیش کرتا ہے جن میں ہر ایک اپنی مخصوص دلچسپی اور لطف کا انداز رکھتا ہے چچا کی چند مصروفیات یا کارگزاریاں ملاحظہ ہوں۔

چچا نے بازی لگائی۔ چچا نے سینما دیکھا۔ چچا نے عشق کیا۔ چچا نے ریڈیو خریدا۔ چچا نے لاٹری لگائی۔ چچا مرید ہوئے۔ چچا نے افطار کرایا.... اس طرح کے ۵۲ حرکات درج ہیں جب کہ ان کے بعد ان کا آخری کام دوستوں نے انجام دیا۔ جب چچا کا انتقال پر ملال ہو گیا۔ ممکن ہے ہاشم عظیم آبادی کے سامنے مشہور مزاحیہ کردار "چچا چھکن رہا ہوں مگر اس نمونے کو پھیلا کر انھوں نے جس طرح ایک پر مذاق کردار کی پوری سوانح مرتب کر دی ہے

وہ انہیں کا کام ہے۔ اس معاملہ میں ان کا موازنہ امریکی مزاحیہ نگار مارک ٹوئن سے کیا جا سکتا ہے بقینیاً چالاک کرہاشم صاحب نے اردو کے مزاحیہ افسانوی ادب میں ایک لافانی کردار عطا کیا ہے اور اس طرح وہ عظیم بیگ چغتائی، انجم مانپوری اور شوکت تھانوی کے صف میں آگئے ہیں

جناب غلام سرور (جو اس وقت وزیر تعلیم بہار تھے) انداز بیاں اور ایک تبصرہ سپرد قلم فرمایا تھا بہ عنوان طرز غالب میں شاعری کرنا۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

...... اسی لئے جب میرزا یہ کہتے ہیں کہ یوں تو دنیا میں ایک سے ایک اور اچھے سے اچھے سخنور موجود ہیں لیکن غالب کا انداز بیاں ہی اور ہے تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ یہی ان کو شاعروں کی صف میں ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔

ایسی صورت میں طرز غالب میں شاعری کرنا دیا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ مگر سورج کو چراغ دکھانا ایک بات ہے اور سورج کی روشنی ضیا گرمی اور حرارت سے اپنا ایک چراغ روشن کرنا دوسری بات ہے۔ چاند کی روشنی بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ وہ تو مانگے کی روشنی ہے اور سورج کی مرہون منت ہے۔ اس کے باوجود ماہِ تاباں کا حسن۔ اس کی چاندنی اور کشش اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

اس پہلو کو سامنے رکھ کر گو ہم ہاشم عظیم آبادی کا انداز بیاں اور دیکھیں اور گرہ پر کھنے کی کوشش کریں تو ہمیں ان کی کاوش اور سعی کی داد دینی پڑے گی۔ ہاشم عظیم آبادی شاعر ہیں۔ عظیم آباد کے رہنے والے ہیں۔ اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی ہے اور انداز میں تنوع ہے۔ ہاشم عظیم آبادی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں پچھلے کئی برسوں میں غالب کی غزلوں اور ان کے اشعار کی تضمین میں لگ بھگ ڈھائی سو غزلیں کہہ ڈالی ہیں۔ جو ملک کے اردو روزناموں، ماہ ناموں اور اخبارات اور رسائل میں برابر جگہ پاتی رہی ہیں۔ اور ادب نواز سخن فہم حلقوں سے داد وصول کرتی رہی ہیں۔ ایک،

تو غزل اور وہ بھی طنزیہ اور مزاحیہ اور پھر طرّہ یہ ہے کہ غالب کی زمین میں غزل کہہ لینا ہی بڑے حوصلے کا کام ہے اور ہاشم صاحب نے ہمت سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دے بھی دیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو کی ادبی اور شعری دنیا کے لئے ایک انوکھا تحفہ ہے۔



مصنّف کی تصانیف

۱۔ اندازِ بیاں اور — غالب کی زمین میں مزاحیہ غزلوں کا دیوان
۲۔ کانفرنسیں — مزاحیہ خاکے
۳۔ پچّا — مزاحیہ خاکے
۴۔ غالب کے خطوط عالم بالا سے۔ ہاشم عظیم آبادی کے نام
۵۔ چند شعراء سے ملاقاتیں
۶۔ خس و خاشاک

ریٹائرڈ لائف

سرکاری ملازمت میں جو بھی ہیں انھیں ایک دن ریٹائر ہونا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دفتر سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہی کوئی دنیا سے رخصت ہو جائے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ شخص بڑا ہی خوش قسمت ہے جو دفتر سے ریٹائر ہونے کے قبل قدرتی موت مر جائے۔ یا کسی حادثہ کا شکار ہو کر دنیا کو خیر باد کہہ دے۔ اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔ اولاً یہ کہ وہ غریب ریٹائرڈ لائف کی کربناکی سے بچ جاتا ہے۔ دوئم یہ کہ اس کی بیوہ کو ایک معقول رقم کے علاوہ مرحوم کا ایک لڑکا سرکاری ملازمت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

میں خود بھی سرکاری سروس میں تھا اور آخر آخر تک سرکار کی خدمت کرتا ہوا ریٹائر ہوا۔ یہ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ اگر سمجھ بوجھ سے کام لے کر ریٹائر ہونے کے قبل اپنا رشتہ دنیا سے منقطع کر کے مرحوم ہو جاتا تو آج میری اولاد کے موج ہی موج تھے۔ لاکھ پتی تو وہ چٹکی بجاتے ہو جاتے۔ اور حصول ملازمت کے لئے در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں بلکہ سرکاری نمائندہ میرے گھر آ کر کہتا .... "چلو بابو .... اپنے ابا مرحوم کی کرسی سنبھالو ....۔" اور بڑے بابو کو نذرانہ دینے کے ساتھ میرے بیٹے پوجا کا بھی خیال رکھیئو ... اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل کے ہونہار لڑکے لاکھ پتی بننے کے لئے جادو کی چھڑی کے متلاشی نہیں، بلکہ سروس کے دوران ہی اپنے باپ کے مرحوم اور آنجہانی ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔

ریٹائر ہوتے ہی سب سے پہلے جس مصیبت کا سامنا ہوتا ہے وہ ہے احساس بیکاری

اور پھر پنشن کے لئے کاغذات تیار کرتے ہیں سر مغزی اس کے بعد متعلقہ دفتر میں پیروی اور خوشامد میں دوڑتے دوڑتے ناک میں دم۔ اگر ملازمت کے دوران دست غیب کی بھی گنجائش رہی ہو تو اس کی یاد میں ہر وقت ایک ٹیس سی جگر میں اٹھتی رہتی ہے۔

ریٹائرمنٹ اپنے ساتھ ایک انقلاب عظیم لاتا ہے۔ دوران سروس صبح سویرے ہوا خوری کو نکل گئے۔ چاق و چوبند ہو کر لوٹے تو شیونگ اور باڈنگ کے بعد اخبار پڑھنے بیٹھ گئے۔ اگر دفتر سے ضروری فائل لینے آئے تو اس کے نپٹانے میں لگ گئے۔ اس درمیان گھر والی نے دسترخوان پر کھانا رکھ دیا تو شکم سیری کے بعد ٹفن ساتھ لے کر سائیکل کی گھنٹی بجاتے اور بچوں کو ٹاٹا کہتے ہوئے دفتر کو سدھارے۔ جہاں ۵ بجے تک خوب مشغولیت رہی۔ اور پھر گھر آنے پر بھی مشغولیت ہی مشغولیت۔ لیکن ریٹائرمنٹ کا پروانہ ملتے ہی نہ وہ صبح خیزی رہتی ہے اور نہ وہ چاپک دستی۔ اور نہ شیو کرنے جلدی اور نہ غسل سے فارغ ہونے کی عجلت۔ تو بجنے کو آئے ہیں مگر بابو صاحب ہیں کہ پلنگ پر پڑے اینڈ رہے ہیں..... اب سگریٹ کہاں! بس بیڑی پر بیڑی پھونکے جا رہے ہیں..... جب دیکھتے دیکھتے گھر والی سے نہ رہا گیا تو ان نے پھٹکارا ـــ کہئے تو بھلا۔ گھر میں سبزی تک نہیں۔ راشن کارڈ نگوڑا پڑا ہے۔ کوئی چینی لانے والا نہیں۔ نفیسن جھاڑو ماری بخار سے بیٹھا ہو رہی ہے اور یہ ہیں کہ بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں اب بھی تو اٹھئے۔ آخر میرے بچے کو آفس جانا ہے کہ نہیں۔ اور پھر منے کو اسکول بھی تو پہنچانا ہے آپ کو..... لیجئے یہ رہا جھولا۔ لپک کر ہاٹ سے ترکاری لے آیئے اور منے کو اسکول چھوڑ کر حکیم لقمان کے یہاں سے میرے کلیجہ کے درد کی دوا لانا نہ بھولئے گا۔ کل بھی منے کو اسکول پہنچانے میں آپ نے اس قدر دیر کر دی تھی کہ گھنٹی لگ گئی تھی..... ٹھیک ہی تو آپ کا بڑا لڑکا کہتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد سے ابا کل سٹھیا گئے ہیں ذمہ داری کا تو ذرا احساس ہی نہیں۔ پتہ نہیں دفتر میں کیسے کام کرتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اگر کوئی اونچا سننے لگے یا پیٹ بہرا ہو جائے تو یہ اس

پر خدا کی خاص رحمت ہے۔ کیونکہ گھر والوں کی ایسی ایسی جلی کٹی اور پتھر پھوڑ باتیں سننے میں آئیں گی کہ اگر قصداً بہرہ نہ بنا جائے تو زندگی تلخ ہو جائے۔

ریٹائرڈ شخص کے شب و روز پنشن کے تصور میں گزرتے ہیں۔ ہر ماہ کی دوسری یا تیسری تاریخ کو اگر صحت اچھی رہی تو پیدل ہی چل پڑے۔ اور اگر اس لائق نہ رہا تو رکشہ پکڑ کر ٹریژری پہنچے اور اپنا کاغذ پیش کر کے باہر رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر کسی منشی دفتر سے ایام گذشتہ پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے ان کو کوئی مطلب نہیں شام کو نکلے مانڈے پنشن کے پیسے جیب میں بہ حفاظت تمام رکھے گھر لوٹے تو ان کا اس طرح استقبال کیا جاتا ہے کہ کیا کسی لیڈر کا ایسا ہوا گت ہوگا۔

ریٹائرڈ لائف میں وقت کاٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ آخر وہ غریب صبح سے شام تک کرے تو کیا۔ اور اخبار و رسائل پڑھے تو کہاں تک اور پھر پنشن کے پیسے سے اخبار خرید کر پڑھنا بھی تو فضول خرچی کے مد میں آتا ہے وہی پیسے اگر ناتی پوتوں کی ناز برداری میں خرچ ہوں تو بہورانی کی نظر میں قدر و قیمت بھی بڑھے۔ اور جب بہو رانی شوہر کے لئے کوئی اچھی چیز پکائیں تو بوڑھے باوا کو فراموش نہ کریں۔ ورنہ غیر کی بیٹی کو کسی کے باپ سے کیا غرض۔

اگر وقت گزاری کے خیال سے کسی کے یہاں گپ شپ کے لئے جائیے۔ تو چند دن تک تو معاملہ ٹھیک رہا۔ لیکن بے کاروں کا کوئی کب تک ساتھ دے سکتا ہے۔ آخر ایک دن صاحب خانہ کو دبی زبان سے کہنا ہی پڑتا ہے کہ آپ کی ہر روز تشریف سے میری دلبستگی تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن اہلیہ کا کہنا ہے کہ اس طرح بچوں کی پڑھائی پہ خراب اثر پڑ رہا ہے ...... لیجئے کس خوبصورتی سے پتہ کٹا۔

اگر کسی کے یہاں نہ جا کر گھر ہی میں پڑے رہئے تو اس پہ کیا چین نہیں گھر والی طعنہ دیں۔ یہ کیا جب دیکھو اونٹی کھٹوانٹی لئے پڑے ہیں اور یہ بھی خیال نہیں کہ اللہ رکھے چار چار بہوئیں گھر کے اندر ہیں ..... آخر ان کو بھی تو آزادی کے

ساتھ چلنے پھرنے کا موقع ملے۔

اگر صبح کی نماز کے بعد ذرا قرأت کے ساتھ تلاوت کیجئے تو سعادت مند بیٹے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہیں۔ بادا جان۔ اتنی بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت کیوں کرتے ہیں کہ ہم لوگوں کی نیند میں خلل پڑے۔ ایسا ہی ہے تو کسی مسجد میں چلے جایا کریں۔

اسی طرح اگر کسی روز ریٹائرڈ دادا اپنے پوتے کو گود میں لئے ٹی۔ وی کے پاس بیٹھ جائیں تو بہو رانی چھمک کر ساس سے کہیں ـــــ بادا تو ایا بے دفت ٹی۔ وی کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم لوگوں کا چترہار دیکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ساس جواب دیں گی ـــــ ارے کیا کرو گی بہو۔ بڑھاپے میں آدمی سٹھیا ہی جاتا ہے اور یہ تو ریٹائر ہونے کے بعد سے کچھ خبطی ایسا بھی لگ رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ ایک ریٹائرڈ شخص مذ فاصل بن کر رہ جاتا ہے اس کے مرنے کے بعد اس کے پسماندگان ٹھنڈی سانس لے کر کہتے ہیں۔

خس کم جہاں پاک۔



میر صاحب کی شیروانی

میر صاحب مرحوم، خدا فریق رحمت کرے برسوں گزر گئے انتقال کیئے لیکن اب بھی جب ان کا تذکرہ آجاتا ہے تو اُن سے وابستہ یادیں سینما کی تصاویر کی طرح سامنے آنے لگتیں ہیں۔ بہت ہی پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔ وضعداری ایسی کہ ایک راہ جو اختیار کرلی تو اسی پہ ہمیشہ گامزن رہے۔

میر صاحب کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اس وقت ان کی عمر ستر سال سے کم نہ ہوگی لمبا قد۔ نہ سری ہڈی۔ گورا رنگ آنکھوں پر آتشی شیشے کا موٹا چشمہ اور کندھے پہ ایک تولیہ جس سے بار بار منھ پوچھتے یا اپنی پیوند لگی شیروانی کی گرد جھاڑتے۔

میر صاحب دادا مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے۔ میر صاحب سے اُن کو اس قدر انس تھا کہ اگر کسی دن مقررہ وقت پر وہ نہ آتے تو دادا جان مرحوم بیچین ہو کر باہر کے صحن میں ٹہلنے لگتے اور جب انتظار کی گھڑی طویل ہو جاتی تو دادا مرحوم اپنے ملازم امامی کو میر صاحب کے گھر دوڑا دیتے.... اور امامی کے پیچھے گلبہار بوا کو۔

ویسے میر صاحب میں بہت ساری ایسی خوبیاں بھی تھیں جو ان کی شہرت کا باعث ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان سب سے قطع نظر میر صاحب کی شہرت اُن کی خستہ حال شیروانی کی وجہ سے خاص طور پر تھی جسے وہ ہر وقت پہنے رہتے۔

میر صاحب کی شیروانی میں لگے ہوئے پیوندوں سے جب کوئی پیوند اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر ان کے کلیجہ پر مونگ دل جاتا تو وہ فوراً خلیفہ جی کے یہاں پہنچ جاتے۔ خلیفہ جی کسی گاہک کے کپڑے یا تے پینٹ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر شیروانی میں

چسپاں کر دیتے ۔ حالانکہ پیوند لگاتے لگاتے محلہ کے سارے درزی تنگ آ گئے تھے بعض درزی تو میر صاحب پر نظر پڑتے ہی لاحول پڑھ کر کترانے لگتے ۔ ان کی شیروانی کا کپڑا اس قدر خستہ اور بوسیدہ ہو گیا تھا کہ اگر اس میں ایک ٹانکا لگایا جاتا تو دس ٹانکے کھل جاتے ۔ محلہ کے کئی درزی ایسے بھی تھے جو کمسنی سے میر صاحب کی شیروانی میں پیوند لگاتے لگاتے نانی اور پوتے والے بھی ہو گئے تھے ۔

یہ شیروانی میر صاحب کو ان کے دادا نے مرنے کے ایک ہفتہ قبل درازئ عمر کی دعاؤں کے ساتھ عطا کی تھی ۔ ویسے مرحوم ہی کے وقت سے اس میں پیوند لگنے شروع ہو گئے تھے ۔ لیکن میر صاحب کے کثرت استعمال سے شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا جب شیروانی میں دو ایک پیوند کا اضافہ ہو جاتا ہو ۔

میر صاحب کو یہ شیروانی اس قدر عزیز تھی کہ اسے ہر وقت زیب تن کئے رہتے ۔ رات کو جب بستر پہ جاتے تو اسے خوب اچھی طرح تہہ کر کے تکیہ کے نیچے رکھ دیتے ۔ شب میں کسی وقت نیند ٹوٹتی تو ٹٹول کر دیکھ لیتے کہ شیروانی محفوظ تو ہے ۔

میر صاحب فٹ بال میچ دیکھنے کے بہت شائق تھے ۔ شاید ہی کوئی ایسا میچ ہوتا جس میں میر صاحب شیروانی میں ملبوس نظر نہ آتے ۔ پتہ نہیں کس مسخرے نے یہ پر کی اڑا دی تھی کہ میر صاحب شیروانی پہنے ہوئے جس ٹیم کی طرف کھڑے ہو جاتے ہیں اس کی جیت لازمی ہے ۔ لہٰذا ہر ٹیم کی یہ خواہش ہوتی کہ میر صاحب اسی کے سائڈ میں کھڑے ہوں ..... ۔ تو صورت حال یہ ہوتی کہ میر صاحب کو دیکھتے ہی دونوں ٹیم کے کیپٹن ان کا ایک ایک ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ۔ اس رسّہ کشی میں میر صاحب کی درگت بننے کے ساتھ ان کی شیروانی کے پیوند دو چار اضافہ ضرور ہو جاتا ۔

میری شدید علالت کے دنوں میر صاحب بھی تیمار داری کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔ کبھی تولیہ سے پیر میں جھاما دیتے ۔ کبھی تھرمامیٹر لگا کر دیکھتے تو کبھی اپنی شیروانی کے دامن سے پنکھے کا کام لے کر میرے منھ پر ہوا دیتے اس دوران بخار میں کمی کے آثار دیکھ کر دادا جان نے اسے میر صاحب کی شیروانی کا کرشمہ سمجھا ۔ اور

انکی شیروانی اتروا کر مجھے اڑھا دی۔ بخار کو مدت معیاد پوری کر کے اترنا ہی تھا لیکن دادا کے اس حسن ظن سے میر صاحب کی شیروانی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ محلہ اور اس کے قرب وجوار میں جو کبھی بیمار پڑتا تو اس کے اعزا مریض کو لے کر میر صاحب کے یہاں پہنچ جاتے۔ اور جب تک شیروانی کا ایک ٹکڑا تعویذ کے طور پر حاصل نہ کر لیتے ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔

میر صاحب ممکن ہے کسی زمانہ میں خوش حال رہے ہوں۔ لیکن اس عالم پیری میں بہت تنگ دست ہو گئے تھے۔ سنتے ہیں جوانی میں افیون کھاتے اور چسکی لگاتے کے باعث کسی کام کے نہ رہے تھے۔ گھر میں جو کچھ بھی تھا اسی کے سہارے زندگی گزارتے رہے۔ مگر جب فروخت کرنے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہا تو خدا نے ان کی خستہ حال شیروانی کو حصول رزق کا ایسا ذریعہ بنا دیا کہ میر صاحب بغیر ہاتھ پیر ہلائے دال روٹی میں خوش تھے۔

میر صاحب کی اس کراماتی شیروانی سے اسکول و کالج کے طلبا بھی مستفید ہوتے وہ کبھی ان کی شیروانی کا دھاگا گلے میں لٹکائے پڑھتے لکھتے بے نیازانہ پیریائے میں وقت گزارتے۔ لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلتا تو سر پیٹ کر رہ جاتے

مشہور ہے کہ عقد کے روز میر صاحب اپنی وہی پیوند لگی ہوئی شیروانی پہنے گھوڑے سے اترے اور مسند پر آکر بیٹھے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور جب عقد کے وقت سسرالی شیروانی پہننے کو کہا گیا تو میر صاحب سہرے کی لڑیاں کمر سے لپیٹ کر بارات واپس لے جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجبوراً میر صاحب کی ضد کے آگے اُن کے ہونے والے خسر کو جھکنا ہی پڑا۔ اور مولانا نے اسی خستہ حال شیروانی میں میر صاحب کا عقد پڑھایا۔

میرے یہاں میر صاحب کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ گھر کا ہر فرد عزت و احترام سے پیش آتا۔ میر صاحب کے تشریف لانے پر جب میں احتراماً کھڑے ہو کر سلام کرتا تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتے۔ اگر دادا جان بیٹھک میں نہ ہوتے تو مجھے اپنے پاس بٹھا کر پہیلیاں بجھواتے یا کبھی پرچیر والی شیروانی بلی عرضواہیں لکھواتے۔ اگر ایسی ملازم کو فرصت رہتی تو اس سے شیروانی میں لگے پیوندوں کی گنتی

کراتے۔ یا پھر اس بیں پناہ گزیں کھٹملوں کے قتل عام کا منظر دیکھتے۔

میرے گھر کے اندر صرف گلبہار بوا ہی ایسی ہستی تھیں جن کو میر صاحب کے نام اور ان کی صورت سے نفرت تھی۔ وہ انھیں میر صاحب نہ کہہ کر شیروانی والا بڈھا کہا کرتیں۔ اور شاید اسی جذبۂ نفرت کے تحت گلبہار بوا نے ایک دن چپکے سے میر صاحب کی چائے کی پیالی میں جمال گوٹا ملا دیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد میر صاحب گھرتی ہو گئے۔ غسل خانہ سے نکل کر بیٹھنے بھی نہ پاتے کہ پھر دوڑ پڑتے گلبہار بوا جب لگا رہی تھیں۔ یا ورچی خانہ سے نکل کر بولیں۔ یہ شیروانی والا بڈھا ایک بار اور پاخانہ جائے گا تو پورے پچاس چکر ہو جائیں گے۔

میر صاحب کی شیروانی کا آدھے سے زیادہ حصہ تبرک اور تعویذ کے طور پر عقیدت مندوں، مریضوں اور طالب علموں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بچی ہوئی شیروانی کو دور سے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ شیروانی ہے یا کوئی عجوبہ شئے۔ اب میر صاحب اسے بہت کم پہنتے۔ زیادہ تر اسے کاندھے پر ڈالے رہتے۔

ایک روز صبح سویرے دادا جان کے رونے کی بھیانک آواز سن کر میں نے سمجھا کہ دادی جان کا انتقال ہو گیا جو ایک عرصہ سے بیمار تھیں لیکن معلوم ہوا کہ میر صاحب کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ جس کی اطلاع انھیں ابھی ابھی ملی ہے۔

تجہیز و تکفین کے بعد دادا جان قبرستان سے لوٹے تو میر صاحب کی شیروانی اپنے بیں لپیٹے لئے آئے اور اسے اپنے مرحوم دوست کی نشانی کے طور پر اپنے کپڑے کے بکس میں بہ حفاظت تمام رکھ کر گھنٹوں اس کے اوصاف بیان کرتے رہے۔

دوسرے روز صبح کو دادا جان قمیص اور پاجامہ پہن کر غسل خانہ سے نکلے ہی تھے کہ بدن نوچتے نوچتے پریشان ہو گئے۔ دیکھا گیا کہ ان کے کپڑوں پر سینکڑوں کھٹمل چہل قدمی کر رہے ہیں۔ دادا جان نے جلدی سے کپڑے اتار پھینکے اور امامی کو حکم دیا کہ میر صاحب کی شیروانی میرے بکس سے نکال کر کوڑے پر ڈال دے۔

ایک گدھے کا خط دوسرے گدھے کے نام

پیارے دوست

مشفق لکھوں شفیق لکھوں مہرباں لکھوں

حیراں ہوں اپنے دوست کو القاب کیا لکھوں

پھر یہ سوچا کہ القاب کے پھیر میں رہا تو لکھ چکا میں اور جا چکا خط۔ لہذا القاب کے بکھیڑے میں نہ پڑ کر آمدم برسر مطلب کے تحت معذرت خواہ ہوں کہ ایک عرصہ کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ وہ بھی جب کہ لفافے کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن جب خط لکھنا ہی ہے تو اضافی قیمت برداشت کرنی ہی ہوگی۔

یہ خط تمہیں ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں جب کہ میرے دل و دماغ میں ایک خلفشار ہے۔ کیوں کہ اب مجھے اپنی قوم کی زبوں حالی اور بے چارگی دیکھی نہیں جاتی۔ ویسے میں خود بھی گدھا ہی ہوں۔ لیکن اسے قدرت کی ستم ظریفی کہو کہ میرے اندر گدھا پن کم اور احساس برتری زیادہ ہے۔ یہی احساس برتری میرے دادا آنجہانی میں بھی تھا۔ جن کی قبر کسی بزرگ کی قبر کے دھوکے میں زیارت گاہ خاص عام بنی رہی تھی......دادا مرحوم کا کہنا تھا کہ گدھوں کے لئے زمانہ کبھی سازگار رہا ہے نہ رہے گا۔ اس کی خاص وجہ ہم گدھوں کا گدھا پن ہے۔ میرے لکڑ دادا مرحوم نے بھی قوم کی زبوں حالی دیکھ کر لیڈرانہ انداز میں تقاریر کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن احساس کمتری میں مبتلا گدھوں نے انھیں گھیر کر اتنی دولتیاں جھاڑیں کہ بیچارے قوم کا درد لئے ہوئے شہید ہو گئے... تو انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں نے بھی حصول آزادی کا نعرہ لگایا اور ہزاروں ہزار گدھوں کو اپنا ہم خیال

بنا کر ایک جلوس کی شکل میں نکلا تو ہم پر لاٹھی چارج کر دیا گیا جس سے بھگدڑ مچ گئی۔ ہمارے سینکڑوں جانباز گدھے شہید ہوئے اور کئی حاملہ گدھیوں کے حمل انسقاط ہو گئے۔ اس حسرت ناک واقعہ کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اب حصول آزادی کی تڑپ میں بہت اضافہ ہو گیا ہے ہمارے شعراء گدھے گل و بلبل اور لب و رخسار کی فرسودہ شاعری سے منھ موڑ کر قومی اشعار کہنے لگے ہیں۔

میرے دوست تمہیں یہ سن کر مسرت ہوگی کہ بہت جلد ایک آل انڈیا گدھا کانفرنس کا انعقاد ہوتے جا رہا ہے جس میں ہماری قوم کے دانشور حصول آزادی کا پروگرام بنائیں گے ۔۔۔۔ یہ خط بہت طویل ہو رہا ہے اس لئے اب اجازت چاہوں گا تمہاری اہلیہ کو ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ امید ہے خیر خوبی سے ڈیلیوری ہو گئی ہو گی۔ بے بی کو بہت پیار اپنی مسز کو میرا سلام عرض کر دو اور مبارک باد بھی۔



جنّت سے براڈ کاسٹنگ

آواز ـــــ میں جنّت ریڈیو اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی آپ نے پیارو قوال اور ممتو اے قوالیاں سنیں۔ اب خبروں کا وقت ہو رہا ہے چند لمحہ انتظار کریں ...... کچھ وقفہ ...... اور پھر آواز ...... یہ جنّت ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اب آپ خبریں سنیں۔

جنّت کے فلیٹ نمبر ۲۰۴۴ سے ایک جنتی مولانا کی اچانک گمشدگی کی جو خبر نشر ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل موصول ہوئی ہے۔ خبروں میں کہا گیا ہے کہ مولانا موصوف چہل قدمی کرتے ہوئے گندم کے اس شجر ممنوعہ تک جا پہنچے جس کے دانے کھا کر حضرت آدم جنّت سے نکالے گئے تھے۔ شامتِ اعمال کہ مولانا نے گرے ہوئے گندم کے دانے چن کر چند روٹیاں بنائیں اور انھیں شہد کے ساتھ تناول فرمالیا اس کے چند ہی گھنٹے بعد رفع حاجت کی خلش محسوس ہوئی مگر جنت میں بم پولس کہاں کہ رفع حاجت کو جاتے۔ جب مولانا کی بے چینی انتہا کو پہنچی تو انھیں ایک تیز رفتار راکٹ کے ذریعہ دنیا میں بھیجا گیا۔ مولانا موصوف راکٹ سے کود کر بم پولس میں گھسے۔ لیکن فراغت کے بعد نہ جانے کہاں روپوش ہو گئے ہیں کہ اب تک ان کا سراغ نہ مل سکا ہے۔

خبر ہے کہ کل سے سارے جنتیوں نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ دودھ کی نہروں میں غوطہ لگاتے لگاتے اور شہد کی نہروں میں کشتی کھینتے کھینتے اوب گئے ہیں۔ بھلا ایسی بھی کیا جنّت کہ جہاں انڈا کھانے کو ترسیں۔ آئس کریم اور چاٹ کو دل ترسے۔ نہانے کو نل نہیں۔ ڈبنگی کے لئے کلب گھر ہے

ناچ گھر اور نہ کوئی ہوٹل ہی ایسا ہے کہ اپنی پسند کی چیزیں کھا سکیں ..... ان کی یہ ہڑتال غیر معینہ مدّت کی ہے۔

جنتیوں کی ہڑتال اور ان کی مانگ سے متاثر ہو کر بہت سارے ملائک بھی گروہ در گروہ سڑکوں پر نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ جب فلک پر ہمیشہ رہنا ہی ہے تو ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم بھی شادیاں کر لیں ان کے ہاتھوں میں جو جھنڈے ہیں ان میں جلی حرفوں میں لکھا ہے ؎

کیسے قسمت کے یہ تارے ہیں
جب سے پیدا ہوئے کنوارے ہیں

جس طرح دنیا کے سائنس داں چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انھیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے ٹھیک اسی طرح یہاں کے سائنسداں فرشتے راکٹوں پر اڑے پھر رہے ہیں۔ وہ شب و روز کوشاں ہیں کہ کسی طرح عرش اعلیٰ تک رسائی ہو جائے اور اگر ممکن ہو تو اس پر قبضہ بھی کر لیا جائے۔

میرے خصوصی نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ کل اچانک ایک حور کی جنس بدل گئی اور ایک نوخیز حور کا کسی منچلے نے اغوا کر لیا۔ اس خبر کا حسرتناک پہلو یہ ہے کہ مرض اغوا یہاں بھی آ پہنچا ہے۔

خبر ہے کہ اسد اللہ خاں غالب نے حضرت رضوان کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں یہ شکایت کی ہے کہ ویسے جنت میں سب کچھ میسر ہے لیکن نہیں ہے تو ایک بھی حجام۔ نتیجہ یہ ہے کہ داڑھی اور سر کے بال بڑھتے رہتے ہیں۔ داڑھی کی طوالت کا یہ عالم ہے کہ سونے کے وقت داڑھی کو رضائی کی طرح اوڑھ لیتا ہوں۔ غالب مرحوم کی مانگ ہے کہ ایک حجام کا جلد از جلد انتظام کیا جائے۔ بہ صورت دیگر کوئی ایسا پوڈر ہی مل جائے جس سے چاروں ابروں کا صفایا ہو جائے۔

قربانی کے ذبیحوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر لوگ پلصراط پار کیا کرتے تھے۔ لیکن اب بہ کثرت لوگ شادی میں طلب کئے ہوئے اسکوٹر اور موپیڈ پر بھی پلصراط

پار کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سائیکلو پر بھی پلصراط سے گزرتے ہیں۔ لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ ڈس بیلنس ہو کر اگر گرے تو کٹے سیدھے جہنم میں۔

ایک دلچسپ خبر یہ موصول ہوئی ہے کہ ایک منچلا بوڑھا دنیا سے تار کا پھید الینا آیا تھا جسے چپکے سے اس نے جنت میں بو دیا۔ وہ پودا بڑھتے بڑھتے سو فٹ کا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس میں سے تاڑی ٹپکنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ بوڑھا ضبط نہ کر سکا۔ اور لگا چلّو چلّو پینے۔ اتفاق سے حضرت جبرئیل موٹر سے ادھر سے گزر رہے تھے۔ ان کی نظر تاڑ تاڑی اور بوڑھے پر پڑی جو تاڑی پی کر بہکنے کے موڈ میں تھا۔ حضرت جبرئیل موٹر سے اتر آئے۔ جب انھیں بوڑھے کے کرتوت سے واقفیت ہوئی تو انھوں نے اسے دو لات رسید کیا۔ اور ایک فرشتے کا پہرا بیٹھا دیا تاکہ پھر کوئی تاڑی نہ پی لے۔

تا خیر سے اطلاع کے مطابق فلک پر جو حشر کا میدان ہے اس میں اب دونوں وقت جھاڑو پڑنے لگی ہے۔ جا بجا خیمے نصب کئے جا رہے ہیں۔ پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا جا رہا ہے۔ حوروں کو خوب بن سنور کر رہنے کا حکم صادر ہوا ہے جن حوروں کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ انھیں خضاب کی شیشی سپلائی کی جا رہی ہے غلمان کی نئی وردیاں سل رہی ہیں۔ دوزخ کے شعلے اور بھڑکائے جا رہے ہیں صور کو ایک ٹیلے پر فٹ کیا جا رہا ہے۔ یہ سرگرمی باعث تشویش ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کب اور کس وقت حضرت اسرافیل صور میں پھونک مار دیں۔ اور قیامت برپا ہو جائے۔ میرے نامہ نگار نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ حضرت آدم اور ماما حوّا کو پروردگار عالم کی طرف سے دوربین سپلائی کی گئی ہے تاکہ جنت کے فلیٹ میں بیٹھے اپنی لاتعداد اولاد کے کارنامے ملاحظہ فرمائیں۔

ابھی ابھی یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ ایک اور حور کی جنس بدل گئی۔

اگر اسی تیزی سے حوروں کی جنس بدلتی رہی تو کیا عجب ہے کہ یہ جنّت عنقریب ایک دن حوروں سے خالی ہو جائے .... خبریں ختم ہوئیں .... اور اب مرحوم جگر مراد آبادی کی غزل سماعت فرمائیں جس کا مطلع ہے ؎

آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی۔



آل انڈیا سخن تکیہ کانفرنس

ایک وسیع پنڈال کے پھاٹک پر جلی حرفوں میں لکھا تھا آل انڈیا سخن تکیہ کانفرنس۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ الہٰی تو یہ۔ کیا سخن تکیہ والے بھی اپنی الگ کانفرنس بلانے لگے تب تو یہ اپنی نوعیت کی ایک انوکھی اور دلچسپ کانفرنس ہوگی۔ سوچا کیوں نہ کانفرنس کی کارروائی سے لطف اندوز ہوا جائے اس خیال کے تحت پنڈال کے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بیچ بیچ لگاتے ہوئے ایک والنٹیر نے بڑھ کر مجھے روکا۔ اور نہایت خشمگیں انداز میں بولے "کیا نام یہ اچھا تماشا ہے کیا نام کہ پنڈال میں دھنستے چلے آ رہے ہیں تو کیا نام اگر آپ ڈیلی گیٹ ہیں تو کیا نام دکھلائیں اپنا شناختی کارڈ۔ ان کی اس پھٹکار سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ضرور یہ کانفرنس صرف سخن تکیہ سے ذوق رکھنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ لہٰذا جب والنٹیر صاحب اتنی ساری باتیں کہہ کہہ سانس لینے کو رکے ہی تھے کہ انھیں کے سخن تکیہ کی نقل اتارتے ہوئے میں نے جواباً عرض کیا کیا نام آپ نے یہ کیسے قیاس کر لیا کیا نام کہ میں سخن تکیہ سے لاتعلق ہیں۔ اور کیا نام اگر میں اپنا شناختی کارڈ کیا نام بھول آیا ہوں تو کیا نام میں کانفرنس میں شریک ہو ہی نہیں سکتا.... اس کے ساتھ ہی والنٹیر صاحب کو پرے ڈھکیلتا ہوا پنڈال کے اندر داخل ہو گیا۔ اور وہ حضرت کیا نام کیا نام کی رٹ لگاتے ہی رہے۔

کانفرنس کے لئے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد ایک خمیدہ کمر بزرگ مائک پر تشریف لائے اور مائک پکڑ کر زور زور سے ہیلو ہیلو کہہ کر بولے....

"مجھے افسوس ہے کہ کانفرنس کی کاروائی بہت تاخیر سے شروع ہوتے جا رہی ہے ایسی کی تیسی۔ جس کے لئے معذرت خواہ ہوں ایسی کی تیسی۔ مگر لیجئے۔ ایسا انتظار کی گھڑی ختم ہوئی اور کانفرنس کی باضابطہ کاروائی شروع کرنے کے قبل صدر کا انتخاب عمل میں لانا ہے (ایسی) کی تیسی۔ لیکن صدارت کے لئے کسی کا نام پیش کرنے کی جھنجھٹ میں نہ پڑکر خود اپنا ہی نام پیش کر رہا ہوں ایسی کی تیسی اس یقین کے ساتھ کہ آپ سب ہی حضرات میری اس گستاخی کی تائید فرمائیں گے ایسی کی تیسی۔

امابعد۔ حاضرین کانفرنس آپ واقف ہیں کہ یہ آل انڈیا سخن تکیہ کانفرنس صرف ان حضرات کی کانفرنس ہے جو سخن تکیہ سے ذوق رکھتے ہیں ایسی کی تیسی ..... یہ مقام مسرت ہے کہ آج ہم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بھائی چارہ گی اور ایکتا کا ثبوت دے رہے ہیں ایسی کی تیسی۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ اس خاکسار کی انتھائی کوشش اور زنگ وور کا نتیجہ ہے کہ یہ روز سفید دیکھ رہے ہیں کہ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ایسی کی تیسی ..... نواب کانفرنس کی باضابطہ کاروائی شروع کرتے ہوئے جناب دھرتی دھمک سے گزارش کر رہا ہوں کہ وہ اپنے خیالات زریں سے حاضرین کو نوازیں۔ ایسی کی تیسی

جناب دھرتی دھمک مائک پر تشریف لائے۔ بہترین سوٹ میں ملبوس کولڈن کمانی کا شیشہ لگائے، ریشمی رومال سے منھ پونچھ کر انھوں نے یوں لب کشائی فرمائی ..... جناب صدر کی یہ غایت کرم فرمائی ہے کہ اس خاکسار کو جو ہو سو ہو سب سے پہلے تقریر کا موقع دے کر جو ہو سو ہو میری عزت افزائی فرمائی ....

.... لہٰذا آمدم بر سر مطلب کے تحت جو ہو سو ہو یہ عرض کروں گا جو ہو سو ہو کہ اس طرح کی آل انڈیا سخن تکیہ کانفرنس بلانے کی اشد ضرورت تھی جو ہو سو ہو اس کی کمی کی خانہ پری کر کے جناب صدر نے ایک کار عظیم انجام دیا ہے جس کیلئے وہ لائق مبارکباد ہیں جو ہو سو ہو۔ اس کانفرنس میں سر جوڑ کر ہمیں سخن تکیہ والوں کی الجھنوں پر غور کرنا ہے اور انھیں سلجھانے کی راہ ہموار کرنی ہے جو ہو سو ہو ملوث ہیں

مجھ ہماری تضحیک اور کیا ہو سکتی ہے بھلا کہ سخن تکیہ آمیز باتیں سن کر لوگ ہنس کر لوٹ جاتے ہیں. ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں جو ہو سو ہو۔ ان کے ان ناپسندیدہ حرکات سے آئے دن دو چار ہو کر ہم سارے سخن تکیہ ہولڈر احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں جو ہو سو ہو صرف یہی نہیں بلکہ ہم بھی ایسے حضرات اپنی سسرال میں دلچسپ کھلونا بن کر رہ جاتے ہیں جو ہو سو ہو۔ دوستو سالے تو خیر سالے ہی ٹھہرے سالیاں بھی سخن تکیہ کی نقلیں اتار اتار کر ہمارا جینا دوبھر کر دیتی ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ قبلہ خسر کے علاوہ خوشدامن صاحبہ بھی جو ہو سو ہو لیں آنچل منہ پر لانے سے باز نہیں آتیں۔ ان حالات کے تحت میری پُر زور گذارش ہے کہ ایک ایسا ریزولیشن پاس کیا جائے کہ کوئی ہمارے سخن تکیہ اور ہمارا طرز گفتگو کا مذاق اڑانے کی جرات نہ کر سکے جو ہو سو ہو۔ اگر ایسا کوئی ریزولیشن پاس نہ کیا گیا تو جان لیں سمجھا یہ کہ وہ دن دور نہیں جو ہو سو ہو کہ ہمارا سڑکوں پر نکلنا۔ کسی سے باتیں کرنا بلکہ سسرال جانا دشوار ہو جائے گا۔ جو ہو سو ہو۔ ویسے اکثر حضرات کا یہ مشورہ ہے کہ کیوں نہیں اس دشواری پر قابو پانے کے لئے سخن تکیہ ہی ترک کر دیا جائے۔ جو ہو سو ہو۔ کہنے تو بھلا کسی کی تضحیک کے ڈر سے ہم اپنا پسندیدہ سخن تکیہ ترک کر دیں۔ ناممکن بعید از قیاس جو ہو سو ہو۔ میں اس بھرے پنڈال میں بہ بانگ دہل کہتا ہوں کہ مرتے دم تک اپنے طرز سخن پر قائم رہوں گا جو ہو سو ہو۔ اور اسی طرح کا عزم مصمم پنڈال میں موجود سبھی سخن تکیہ ہولڈر بھی کریں جو ہو سو ہو۔

اور اب بیرون صوبہ سے تشریف لائے حضرت ستارہ آسمانی اظہار خیال فرمائیں ایسی کی تیسی۔ جناب صدر نے آواز دی۔

حضرت ستارہ آسمانی اپنے بھاری بھرکم سخن تکیہ کے ساتھ ڈائس پر قدم رنجہ فرماتے ہی بولے — حاضرین کانفرنس سمجھا کہ نہیں حضرت میں مختلف امراض میں مبتلا رہنے کے باوجود اس کانفرنس کے انعقاد کا مژدہ سنتے ہی دوڑا چلا آرہا ہوں سمجھا کہ نہیں حضرت لیکن اپنی گرتی ہوئی صحت اور نقاہت کے باعث ممکن ہے دیر تک

تقریر نہ کر سکوں۔ سمجھا کہ نہیں حضرت ..... بہرحال .... تو پہلے میں یہ عرض کردوں کہ جناب دھرتی دھمک کی عالمانہ تقریر سے مجھے کلی اتفاق ہے سمجھا کہ نہیں حضرت اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ سخن تکیہ سے ذوق رکھنے والوں میں ایکتا اور اتفاق کا فقدان ہے سمجھا کہ نہیں حضرت اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا کوئی معیار زندگی نہیں اور نہ کوئی ہمیں اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے سمجھا کہ نہیں حضرت۔ لیکن اب جب کہ سخن تکیہ ہولڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنا مستقبل سنوارنے اور شاندار بنانے کیلئے کوشاں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا معیار زندگی بلند سے بلند تر نہ ہو۔ سمجھا کہ نہیں حضرت اس سلسلے میں ناچیز ستارہ آسمانی کا یہ مشورہ ہے کہ ہمارا ایک اخبار اور ایک رسالہ بھی شائع ہوا کرے۔ سمجھا کہ نہیں حضرت جس میں سخن تکیہ سے ذوق رکھنے والے حضرات کے مضامین ان کے نمایاں سخن تکیہ کے ساتھ شائع ہو کریں سمجھا کہ نہیں حضرت اس طرح ہمارا ایک وقار قائم ہوگا اور عوام کی نظروں میں ہماری قدر و منزلت بھی بڑھے گی۔ سمجھا کہ نہیں حضرت .... اور اب واقعی نقاہت کی وجہ سے سلسلہ تقریر جاری رکھنے میں وقت محسوس کر رہا ہوں سمجھا کہ نہیں حضرت لہذا بادل ناخواستہ اپنی تقریر نامکمل چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں سمجھا کہ نہیں حضرت۔

جناب موصوف کے پیٹھ پھیرتے ہی جناب صدر نے آواز دی اب جناب چکی چٹنوی تشریف لاکر اظہار خیال فرمائیں ایسی کی تیسی۔

جناب چکّی چٹنوی زلفی اور حنائی ریش کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے وہ بیک نظر کسی خانقاہ کے سجادہ نشین معلوم ہوتے تھے۔ ان کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر میں نے سوچا۔ بھلا ان کا بھی کوئی سخن تکیہ کا ہے کو ہوگا ضرور یہ بھی میری طرح بہر تفریح پنڈال میں چلے آئے ہیں لیکن جب انھوں نے لب کشائی کی۔ تو میں دنگ رہ گیا۔ ارے یہ حضرت بھی سخن تکیہ ہی کے مریض ہیں.... ڈائس پہ آتے ہی یوں گویا ہوئے ..... حاضرین کانفرنس خدا کے فضل سے تمہید کو بالائے

طاق رکھ کر عرض کر دوں گا کہ سخن تکیہ سے ذوق رکھنے والے خدا کے فضل سے دوران گفتگو ایک اضافی جملہ بار بار دہرا کر اپنی گفتگو میں چار چاند لگاتے ہیں خدا کے فضل سے لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ نا فہم حضرات ہمارا مذاق اڑاتے ہیں خدا کے فضل سے حالانکہ ان کے ایسے برتاؤ سے ہماری دل شکنی ہوتی ہے خدا کے فضل سے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سارے سخن تکیہ والے اپنی گفتگو میں احتیاط کو راہ دینے لگے ہیں خدا کے فضل سے۔ اگر ان کے احتیاط اور ترک سخن کی یہی رفتار رہی خدا کے فضل سے تو وہ دن دور نہیں کہ جب آئندہ سخن تکیہ کانفرنس میں الو نہ بولیں تو میرا نام بدل دینا خدا کے فضل۔

جناب چکی چٹنوی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ انھیں اس روز کی سرسری ابھی کہ رکنے ہی کو نہ آئی۔ اس بے وقت کی کھانسی میں پنڈال کے اندر موجود تقریباً سبھی بوڑھوں نے دل کھول کر ساتھ دیا۔ جب ان بوڑھوں کی کھانسی تھمتے تھمتے تھمی تو دیکھا گیا کہ جناب چکی ڈائس پر بے سدھ پڑے ہیں۔ تب ہی جناب صدر کے مائک پر اعلان کیا۔ اب عظیم آباد کے ایک ایسے شخص کو دعوت تقریر دے رہا ہوں ایسی کی تیسی جنہیں ان کی گمنامی کی وجہ سے دعوت نامہ نہ بھیجا جاسکا تھا ایسی کی تیسی۔ لیکن ابھی ابھی انھوں نے ایک سلپ بھیج کر اپنے تعارف کے بعد کانفرنس سے متعلق اظہار خیال کی پیش کش کی ہے۔ ایسی کی تیسی۔ تو ان کے اس جذبہ خلوص کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی...... جی ہاں وہ ہیں جناب ہاشم عظیم آبادی ایسی کی تیسی...... تو مائک پر تشریف لائیں جناب ہاشم عظیم آبادی اور ہاں یہ بتا دوں کہ صاحب موصوف کا سخن تکیہ ہے آپ کے منہ میں ایسی کی تیسی ہیں نے لپک کر مائک سنبھالا۔ اور صاحب صدر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولنے عرض کیا۔ مجھے بے حد افسوس ہے آپ کے منہ میں کہ مجھے تقریر کے لئے ایسے وقت میں پکارا گیا ہے آپ کے منہ میں جب کہ میں شدت سے پیشاب کی خواہش محسوس کر رہا ہوں آپ کے منہ میں۔ لہذا اگر آپ اجازت دیں تو پیشاب

سے فارغ ہوئوں آپ کے منہ میں ..... لیجئے۔ یہ کہنا تھا کہ جناب صدر نے ایسی کی تیسی کہتے ہوئے میری گردن ناپی۔ ان سے گلو خلاصی کے لئے داؤں پر لاکر انھیں ایسا دھوبیا پاٹ مارا کہ وہ ڈائس کے نیچے چاروں شانے چت گرے اور قبل اس کے کہ دوسرے افراد کانفرنس مجھ پر ٹوٹ پڑیں میں نے راہ فرار اختیار کی ورنہ آل انڈیا تحق تکیہ کانفرنس میں میرا یہ مذاق بہت مہنگا پڑتا۔



قابض ارواح کی التجا بارگاہ ربّ العزّت میں

خداوندا۔ روح قبض کرنے کی جو ڈیوٹی میرے سپرد ہے اُسے انتہائی جانفشانی۔ محنت۔ لگن اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتا آرہا ہوں۔ اس فرض کی ادائیگی میں شاید ہی مجھ سے کبھی ایسی بھول ہوئی ہو جو قابل گرفت ہو لیکن اب سے بہت پہلے نہ تو دنیا کی اتنی بھیر آبادی تھی اور نہ شرح اموات میں یہ تیز رفتاری تھی نتیجہ یہ ہے کہ میرا کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ دم مارنے کی فرصت نہیں رہتی۔

ایک وہ زمانہ بھی تھا میرے معبود جب انفرادی موت ہوا کرتی تھی کسی کی مدت حیات پورے ہونے کی خبر ملتے ہی اطمینان سے ٹہلتا ہوا جاتا اور مرنے والے کی روح قبض کرکے دفتر میں بیٹھا دنیا کی بے ثباتی پر غور کیا کرتا۔ لیکن آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب سے دنیا کے لوگ مرگ انبوہ جشنے دارد کے اصول پر اجتماعی موت کو ترجیح دینے لگے ہیں تب سے یہ مشکل کام کا نپٹارا ہوتا ہے۔ اگرچہ دوربار میز ائیل کی ایجاد کے بعد سے دور و دراز علاقہ سے بھی دفتر میں بیٹھے بیٹھے روح قبض کرلیا کرتا تھا لیکن جب سے سنا ہے کہ مولوی صاحب نماز پڑھاتے وقت لاوڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز سمجھے ہیں تب سے دوربار میزائیل کا استعمال میں نے اس ڈر سے چھوڑ دیا ہے کہ کہیں اس مشین کا استعمال آپ کی ناراضگی کا باعث نہ ہو ورنہ سائنس کی یہ ایجاد میرے لئے بڑی کارآمد تھی۔

خداوندا۔ اب تو آئے دن چلتی ٹرینوں میں بم کے دھماکے ہونے سے ہزاروں ہزار افراد کی روحیں بہ یک وقت قبض کرنی پڑتی ہیں۔ ہوائی جہازوں میں ٹائم

بم کے دھماکے سے مسافروں کے پرخچے اڑا کر ان کے اعضا دور دور تک بکھر جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے فرائض انجام دے ہی رہا ہوں لیکن کب تک آخر عمر کا بھی تو تقاضہ ہے کچھ۔

خداوندا۔ دنیا کی آبادی اگر اسی طرح بڑھتی رہی اور روح قبض کرنے کی ڈیوٹی میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو کیا عجب ہے کہ کثرت کار کے باعث مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی سرزد ہو جائے جو میرے سابقہ پچھلے ریکارڈ پر پانی پھیر دے اس لئے خاکم بدہن میری یہ التجا ہے کہ شعبۂ اموات جس کا روز اول سے میں سربراہ ہوں۔ اسے دو شعبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یعنی ایک شعبہ اموات حیوان ناطق اور دوسرا شعبہ اموات حیوان مطلق۔ مجھے شعبۂ اموات حیوان ناطق کا انچارج بنایا جائے اور شعبہ اموات حیوان مطلق کے لئے ایک ہول ٹائم قابض ارواح کی بحالی کی جائے اس طرح میں راحت کی سانس لے سکوں گا اور میری efficiency بھی برقرار رہ سکے گی۔

اور ہاں۔ عام طور پر روح قبض کر کے فرداً فرداً روانہ کر دیا کرتا تھا لیکن کثرت کار کے باعث اب اتنی فرصت ہی نہیں رہتی۔ لہذا روح قبض کر کے ایک تھیلے میں بھرتا جاتا ہوں۔ اور جب تھیلا بھر جاتا ہے تو اسے عالم بالا روانہ کر دیتا ہوں لیکن اس طریقہ کار میں دقت یہ ہو رہی ہے کہ موقع ملتے ہی اکثر شریر روح تھیلے سے نکل بھاگتی ہے جسے بڑی مشکل سے گرفت میں لاتا ہوں۔ اس کے تدارک کے لئے یہ بھی التجا ہے کہ بہت بڑا نہیں تو کم از کم گول گھر کے برابر ہی ایک پنجڑا عنایت کیا جائے جس میں روحیں قبض کر کے رکھتا جاؤں۔ اور جب پنجڑا بھر جائے تو اس پر اپنی مہر لگا کر ڈیسپیچ کر دیا کروں۔ اس طرح روح کے نکل بھاگنے کا احتمال نہ رہے گا۔



داماد کا انتخاب بذریعہ انٹرویو

جو شخص ولایت پلٹ ہو۔ جس کا رہن سہن انگریزیت کے سانچے میں ڈھلا ہو۔ جو ہندوستانی تہذیب سے بیزار ہو۔ جس نے اپنی بیگم کو اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا ہو۔ اور جس نے اپنی لاڈلی بیٹی کو انگریزی اٹھان پر پروان چڑھایا ہو۔ وہ بھلا کب گوارہ کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کا رشتہ پرانے طریقہ پر مشاط کے ذریعہ طے ہو۔ بیگم اگر کہتیں کہ مشاط کے ذریعہ لائے ہوئے رشتہ پر غور کرتے ہیں کیا قباحت ہے جو آپ اس قدر بدکتے ہیں..... آخر میری جو شادی آپ سے ہوئی تو مشاطہ ہی کی معرفت ― سرفراز صاحب جواب دیتے تب ہی تو میرے اور تمہارے مزاج میں ہم آہنگی نہیں..... خدا کے واسطے بیگم تم شائستہ بیٹی کے معاملہ میں مجھے اپنی راہ پر چلنے پر مجبور نہ کرو ― میرا اٹل فیصلہ ہے کہ اپنے داماد کا انتخاب بذریعہ انٹرویو کروں گا اور دیکھنا کیسا ہیرا داماد لاتا ہوں۔

سرفراز صاحب نے انگریزی اخبار میں ضرورت رشتے کا اشتہار چھپوا دیا۔ جس میں امیدوار کو اپنی فوٹو کے ساتھ دس روپیہ کا پوسٹل آڈر بھیجنا لازمی تھا اشتہار میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی تھی کہ جن کے سر میں بال کم ہوں وہ ہرگز درخواست نہ دیں۔ کیونکہ شادی کے بعد جب سر کے بال جھڑنے لگتے ہیں تو پھر باقی ہی کیا بچے گا۔ ساتھ ہی انٹرویو میں اپنے خرچ سے آنے کی شرط تھی۔

انٹرویو کے روز جب ممبران (بیگم سرفراز۔ ان کی بیٹی شائستہ، اور سرفراز صاحب بہ حیثیت چیرمین کرسی صدارت پر بیٹھ گئے تو سگار کا دھواں پھینکتے ہوئے سرفراز صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی کے حاضر ہونے پر انگلی نے پوچھا "کیا سب

ہی امیدوار آگئے۔ حاضری لے لی گئی۔ کتنے اُمیدوار ہوں گے اندازاً۔

حضور! چپراسی نے عرض کیا۔ میں نے حاضری لے لی ہے۔ پورے پانچ سو ہیں! یہ سن کر سرفراز صاحب چونک پڑے۔ کیا کہا پانچ سو! کہیں میرے کرانی نے سب ہی امیدواروں کے نام انٹرویو کا رڈ تو نہیں اِشو کر دیا۔ اتنے لوگوں کا انٹرویو لینا کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوا۔

باپ کی باتیں سن کر لاڈلی بیٹی بولی۔ ڈیِل فادر آپ اس قدر نروس کیوں ہوتے ہیں آپ ان سب ہی امیدواروں کو ایک قطار میں کھڑا کرا کے ریس کرا دیں اس طرح بہت سارے امیدوار خود بخود چھٹ جائیں گے۔

گڈ آئیڈیا ___ سرفراز صاحب اچھل پڑے۔ انھوں نے چپراسی کو حکم دیا۔ دیکھو سو سو کا گروپ بنا کر اُمیدواروں کو دن۔ تو تھری کہہ کر دوڑا دو۔ اور ہر گروپ میں ایک سے دس نمبر پر آنے والے امیدوار کی فہرست بنا کر پیش کرو۔

چپراسی نے حسب ہدایت انھیں ریس کرنے کو کہا۔ تو سب ہی ایک زبان ہو کر چلائے۔ ہم لوگ پولس میں بھرتی ہونے کو نہیں آئے ہیں۔ ہم لوگ شادی کے امیدوار کی حیثیت سے انٹرویو میں آئے ہیں۔ کیسے دو اس چلچلاتی دھوپ میں دوڑ نہیں لگا سکتے ـــ تب ہی ایک اسمارٹ امیدوار نے آگے بڑھ کر کہا۔ سکھا ہو داماد کے انتخاب کے سلسلے میں ریس کرانا ایک بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے پھر بھی میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہونے والے خسر امیدوار کے اسمارٹ ہونے کا ثبوت چاہتے ہیں۔ لہذا ہم لوگ دوڑ لگائیں۔

ایک سے دس نمبر پر آنے والے پچاس ناموں کی فہرست جب چپراسی نے پیش کی تو بیگم ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔ میرے خیال سے یہ تعداد بھی زیادہ ہے مزید تخفیف کے لئے انھیں گھانس چھیلنے میں لگا دیا جائے۔ اس طرح چھٹنی کے ساتھ لان کی بڑھی ہوئی گھانس بغیر خرچ کے کٹ جائے گی۔

اس مشورہ سے متاثر ہو کر سرفراز صاحب نے بیگم کو بہ نظر تحسین دیکھا اور

مسکرا کر بولے ۔ بڑے دُور کی کوڑی لاتی ہو بابی گارڈ " ..... یہ کہہ انھوں نے پھر گھنٹی بجائی ۔ اور چپراسی کو ہدایت کی کہ ان پچاس امیدواروں کو لان کی گھانس چھیلنے میں لگا دو اور جو اس کام میں ہشیار اور تجربہ کار نظر آئیں ان کی فہرست بنا کر انٹرویو کے لئے پیش کرو ۔

چپراسی نے باہر آ کر جب انھیں لان کی گھانس چھیلنے کو کہا تو سب ہی امیدوار بھڑک اٹھے " یہ کیسا انٹرویو ہے صاحب کہ ابھی ابھی ہمیں اس تیز دھوپ میں دو میل دوڑایا گیا ۔ اور اب ہمیں گھانس چھیلنے کو کہا جا رہا ہے .... اس کے ساتھ ہی مارو مارو کا جو شور ہوا تو چپراسی بھاگتا ہوا کمرے کے اندر آیا ۔ اور اندر سے زنجیر چڑھا کر ہانپتا ہوا بولا ۔ حضور غضب ہو گیا ۔ جان کی خیر نہیں ۔ تب ہی گملے پھینکے جاتے کرسیوں کے پٹکنے اور دروازوں کے شیشے توڑتے کی آوازیں سن کر سرفراز صاحب بے ہوش ہو کر کرسی پر لڑھک گئے ۔ ان کی اہلیہ پہلے ہی بدحواس ہو چکی تھیں ۔ اس وقت ان کی بیٹی ہی کی ذہانت کام آئی ۔ اس نے قریبی تھانہ میں فون کر کے پولس بلوائی ۔ جس نے آتے ہی لاٹھی چارج کر دیا جس کی زد میں بیسیوں افراد آ گئے اور ایسی بھگدڑ مچی کہ شادی کے سارے امیدوار انٹرویو کی حسرت لئے بھاگتے نظر آتے ۔



میری ملاقات ابلیس سے

میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ باہر سے آواز آئی کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ قبل اس کے کہ میں جواب دوں وہ حضرت پردہ اٹھا کر اندر چلے آئے اور نہایت بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ کر بولے۔ مجھے ابلیس کہتے ہیں میں انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا تو وہ مسکرائے۔ تمہیں یقین نہیں آرہا ہے شاید۔ لیکن درحقیقت میں ابلیس ہی ہوں۔ وہی ابلیس جو کبھی معلم الملکوت تھا۔ جو صرف ایک سجدہ نہ کرنے کے جرم میں راندۂ درگاہ ہو کر جنت سے نکالا گیا.... پھر بھی مجھے حیرت زدہ دیکھ کر بولے۔ اچھا ٹھہرو میں تمہیں ابلیس ہونے کا عملی ثبوت دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور دندناتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ اس وقت ایک فرقہ کا جلوس ادھر سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے ایک ڈھیلا اٹھا کر جلوس کی طرف اچھال دیا۔ جس کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی مارو مارو کے شور کے ساتھ بلم برچھا اور تلوار کا آزادانہ استعمال ہوا۔ مشتعل ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے پولس کو گولیاں چلانی پڑیں۔ کئی لاشیں گریں اور سینکڑوں افراد زخمی ہوئے اور کافی تعداد میں لوگ گرفتار کرکے جیل بھیجے گئے.... وہ حضرت اپنا ابلیسی کارنامہ دکھا کر اطمینان سے آرام کرسی پر لیٹے رہے۔ اس درمیان کرفیو لگ گیا تھا.... لیکن وہ حضرت اس سے بے نیاز پردہ اٹھا کر باہر نکل گئے

میرے پڑوس میں اختر صاحب نام کے ایک شخص کچھ دنوں سے رہ رہے ہیں ان کی ازدواجی زندگی اتنی پُرمسرت ہے کہ اس کی مثال دی جاتی ہے۔ ایک دن جناب ابلیس اختر صاحب کے مکان سے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس کے

چند ہی روز بعد شور و غل سن کر از رہِ قرب مکانی دوڑا ہوا اختر صاحب کے یہاں پہنچا دیکھا کہ اختر صاحب کے خسر غصہ میں تمتمائے بیٹھے ہیں۔ اور ان کے تین پہلوان نما بیٹے اپنے بہنوئی کو مارنے مرنے پر تلے ہیں۔ اور مغلظات کے ساتھ طلاق طلاق کی رٹ لگا رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ معاملہ طلاق ہی پر ختم ہوا اور میں اختر صاحب کی اس قدر پُر مسرت زندگی کے حسرتناک انجام پر افسوس کرتا ہوا واپس آ رہا تھا کہ ابلیس پر نظر پڑ گئی۔ وہ فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔

ایک صاحب صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند ہیں۔ ڈاڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے۔ نماز باجماعت پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کیا کرتے ہیں۔ ایک روز دیکھا کہ جناب ابلیس نوٹ ہاتھ پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے۔ اور واقعی ہوا بھی وہی جس کا خدشہ محسوس کیا تھا یعنی صاحب موصوف کچھ ہی دنوں بعد سینما گھر کے پاس نظر آئے۔ ان کی لمبی ہوئی داڑھی غائب تھی۔ اور لطف یہ کہ ادھر مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور ادھر یہ حضرت اس سے بے نیاز سینما کی ٹکٹ کٹانے کے لئے لائن میں کھڑے تھے۔

اور پھر کچھ دنوں بعد حضرت ابلیس ایک تقریب میں نظر آئے وہ نوشاہ کے والد کے پاس بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر ان کے کان میں کچھ کہتے اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ اس اثنا میں مولانا صاحب عقد پڑھانے کو آگے بڑھے تو نوشاہ کے والد نے انہیں اشارے سے روک کر کہا "مولانا پہلے یہ تو طے ہو جائے کہ طے شدہ چیزوں کے علاوہ میرے سمدھی صاحب رنگین ٹی۔ وی اور اسکوٹر دے رہے ہیں یا نہیں اور یہ کہ لڑکے کو جب تک سروس نہیں ہے، اس کے جیب خرچ کے لئے کتنے روپے ہر ماہ گرانی بھتہ کے ساتھ ملتے رہیں گے۔" یہ سنتے ہی لڑکی کے والد بے ہوش ہو گئے جب ہوش میں آئے تو لڑکے کے والد کے پیر پر ٹوپی رکھ کر بولے۔ بھائی صاحب ساری باتیں طے ہو جانے کے بعد یہ فرمائش کیوں — مجھ پر رحم کیجئے میری عزت آپ کے ہاتھ [illegible] برادری [illegible] دکھ کر وہ [illegible] بے ہوش ہو گئے

ان کی اس بے بسی پر ترس کھا کر محلہ کے چند نوجوان لاٹھیاں لے کر براتیوں پر ٹوٹ پڑے۔ دولہا بابو کے والد محترم پر وہ بے بھاؤ کی پڑی کہ ڈولی پر لاد کر گھر لائے گئے۔

پھر ایک عرصہ بعد مسٹر ابلیس پٹنہ مارکیٹ میں نظر آئے ہیں ان کی نظروں سے بچتا ہوا ایک گھڑی کی دوکان میں جا کر گھڑی دیکھنے لگا اتنے میں چٹاچٹ کی آواز سن کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی ایک نوجوان لڑکے کے سر پر جوتیاں برسا رہی ہے اور لوگ تماشائی بنے دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے اس غریب کی بے بسی نہ دیکھی گئی۔ بمشکل اُسے لڑکی کے چنگل سے چھڑا کر میں نے الگ لے جا کر پوچھا میاں صاحبزادے تمہیں یہ کیا سوجھی کے سر بازار جوتیوں سے تواضع کی گئی ــــ وہ بڑی معصومیت سے بولا میں نے پٹنہ مارکیٹ میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بزرگ صورت شیرانی میں ملبوس کھڑے ہوئے مل گئے۔ وہ مجھے سو روپیہ کا ایک نوٹ دکھا کر بولے۔ میاں یہ نوٹ تمہارا ہے۔ بشرطیکہ وہ سامنے جاتی ہوئی لڑکی کی چوٹی کھینچ کر دکھا دو۔ اور پھر نہ معلوم کس شیطانی طاقت کے زیر اثر نہ چاہنے پر بھی آگے بڑھ کر اس کی چوٹی کھینچ لی اور اس کے بعد جو میری درگت بنی وہ آپ دیکھ ہی چکے۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ وہی بزرگ جو ایک بار پہلے بھی تشریف لا چکے ہیں ڈرائنگ روم میں میرے منتظر ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نے زور سے کہا ــــ لاحول ولاقوۃ۔ یہ کہنا تھا کہ مسٹر ابلیس چھلانگ لگا کر اس تیزی سے بھاگے کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔



منشی کفایت اللہ

خدا بخشے منشی کفایت اللہ کو ۔ ان کے انتقال کئے ایک عرصہ گزرا۔ لیکن اب بھی جب کفایت شعاری کی بات آجاتی ہے تو منشی کفایت اللہ ضرور یاد آجاتے ہیں ان کا نام تو کچھ اور ہی تھا۔ مگر مشہور اسی نام سے تھے ۔ وثیقہ نویسی کی وجہ سے منشی کہلاتے لیکن کفایت اللہ نام کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ حضرت ہر کام میں کفایت شعاری کو راہ دیتے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ۔

منشی کفایت اللہ کا قد چھ فٹ سے کم نہ تھا لیکن وہ اپنا پاجامہ صرف دو گز میں سلواتے جو دور سے دیکھنے میں ہاف پینٹ دکھائی دیتا ۔ ان کے پاجامہ پر جیب صاف پینٹ کی پھبتی کسی جاتی تو وہ اسے کھینچ کر نیچا کرنے کی کوشش کرتے اس کوشش میں ازار بند ٹوٹ جاتا ۔

ان کی قمیص میں بھی صرف بائیں ہاتھ کی آستین ہوتی ۔ وہ کہا کرتے ۔ یہ بھی کوئی تک ہے کہ داہنا ہاتھ کبھی آستین کے اندر رہے ۔ حالانکہ ہر وقت اس سے کام لیا جاتا ہے بار بار آستین چڑھانے کی زحمت ہی کیوں کی جائے ۔ اور پھر اس طرح کفایت شعاری کا ایک پہلو بھی نکل آتا ہے ۔

منشی کفایت اللہ کے پاس نہ جانے کب کا ایک چھاتا تھا جس میں لگائے گئے کپڑے کا بخیہ ادھڑ چکا تھا۔ صرف تیلیاں باقی تھیں۔ پھر بھی دھوپ سے بچنے کا خیالی تصور باندھے اسی چھاتے کو لگا کر کچہری جاتے ۔

منشی جی کا چشمہ شیشے سے بے نیاز تھا۔ کہتے ہیں کہ محلے کے تٹ کھٹ مؤذن سے

جھگڑا ہو جانے سے چشمہ کے دونوں شیشے چور چور ہو گئے تھے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ صرف فریم لگا کر وثیقہ نویسی کا کام بہ خوبی انجام دیتے۔

منشی کفایت اللہ کی ٹوپی تیل سے چکٹ اور گرد و غبار سے اٹی رہتی لیکن وہ اسے دھوتے یا صاف کرنے کا نام نہ لیتے۔ ایک دن کسی منچلے لڑکے نے ان کی ٹوپی غائب کر دی۔ منشی جی کو اس خستہ حال ٹوپی کا اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کے غم میں تین روز تک نہ تو کچہری گئے اور نہ گھر سے باہر نکلے۔

ان کی شادی عالمِ جوانی میں ہو چکی تھی۔ لیکن حرکات ایسے ناپسندیدہ تھے کہ نہ تو سسر نے تھوکا اور نہ سالے اور سالیوں نے قدر کی۔ بیوی تو خیر بیوی ہی تھی۔ وہ بھی مشرقی عورت۔ مگر منشی کفایت اللہ کے عقدِ نکاح میں بندھ کر تقدیر ہی پھوٹ گئی تھی غریب کی نہ کھانا اگت کا۔ نہ کپڑا ڈھنگ کا اور نہ سلیقے کا رہن سہن ہی۔ اس پر سے بات بات پر طلاق کی دھمکی اور کبھی کبھی دھول دھپہ بھی جب بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اپنے میکے جا بیٹھیں۔ کچھ دنوں منشی کفایت اللہ خود ہی چولہا چکی کرتے رہے۔ لیکن جب چولہا پھونکتے پھونکتے آنکھیں سرخ رہنے لگیں تو بیوی کی یاد آئی۔ ایک دن کچہری سے اٹھے تو سیدھے سسرال کا رخ کیا کہ نے آئیں بہلا پھسلا کر گھر والی کو۔ لیکن سالوں کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ اب انھیں مجبوراً ہوٹل کا سہارا لینا پڑا۔ ہوٹل میں کھانے کے دوران روٹی کے جو ٹکڑے بچ جاتے تو اسے رومال میں لپیٹ کر گھر لے آتے۔

جب بیوی کو راضی کر کے گھر لانے یا بہ صورت دیگر دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا جاتا تو منشی کفایت اللہ کہتے۔ نا بابا نا۔ میں کان پکڑتا ہوں بڑے مزے میں کٹ رہی ہے میری۔

وثیقہ نویسی سے اتنا کما لیتے تھے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئی۔ رفتہ رفتہ ان کی صحت گرنے لگی۔ وہ کہتے ہوٹل میں کھاتے رہنے کی وجہ سے زیادہ تر بیمار رہنے لگا ہوں۔ کبھی کھانسی۔ کبھی بخار۔ کبھی پیچش تو کبھی معدے کا فساد۔ مگر دوا کے نام پہ ایک پھوٹی

کوڑی خرچ نہ کرتے۔ بس یہی کسی نے کوئی جڑی بوٹی بتادی تو اسی کو کوٹ پیس کر اللہ شافی اللہ کافی کہہ کر حلق سے نیچے اتار لیتے۔

جب ہوٹل جانے کی صلاحیت نہ رہی تو پھر مخلص احباب نے مشورہ دیا کہ اب بھی تو گھر والی کو لے آئیں بیوی سے ہزار تعلقات کشیدہ سہی پھر بھی مشرقی عورت شوہر کی خدمت سے منھ نہیں موڑ سکتی۔ مگر وہ ہمیشہ انکار ہی کرتے مگر ایک دن منشی جی ٹم ٹم پر سوار ہو کر سسرال جا پہنچے۔ پہلوان سالوں کی اُن پر نظر پڑی تو تاؤ میں آکر انھوں نے چاہا کہ منشی کفایت اللہ کی خبر لیں لیکن ان کے بغل میں ایک مٹری دبی دیکھ کر سنبھلے۔ انھوں نے سوچا ہو نہ ہو نوشاہ بھائی عمر بھر کی جمع پونجی لے کر گھر لوٹے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ خوب خاطر مدارات ہونے لگی۔ سالیاں اور سالے ایک پیر پر کھڑے رہتے۔ چھ ماہ تک ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہیں۔ سالیاں اگر سر میں تیل مالش کر رہی ہیں تو سالے پاؤں دبا رہے ہیں خوشدامن صاحبہ داماد کی بلائیں لے رہی ہیں تو قبلہ خسر بار بار مزاج پرسی کو حویلی میں تشریف لا رہے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے وہ مبارک گھڑی آئی جس کا بے چینی سے انتظار تھا یعنی منشی کفایت اللہ کا دم ٹوٹنا تھا کہ سالے سالیاں۔ بہ شمول خوش دامن اور قبلہ خسر صاحب منشی جی کی گٹھری پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑے لیکن جب گٹھری کھول گئی تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیوں کہ اس میں صرف روٹی کے سوکھے ٹکڑے تھے۔ وہی روٹی کے ٹکڑے جنہیں وہ ہوٹل سے لاکر جمع کرتے رہے تھے۔



میرے فرضی مرض کے چار معالج

ویسے بفضلہ تعالیٰ میں بہت کم ہی بیمار پڑتا ہوں۔ یہی اکثر زکام کی کیفیت کا شکار ہو گیا تو ہو گیا۔ علاج کے لئے اگر حکیم صاحب سے رجوع کیا تو دوا تجویز کر کے وہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ کھانے میں روٹی استعمال کریں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے یہاں گیا تو وہ نسخہ لکھ کر یہ ہدایت کرتے ہیں کہ روٹی نہیں چاول کھائیں۔ حکیم اور ڈاکٹر کی اس دورنگی ہدایت پر میں نے سوچا کہ دونوں کے طریقہ علاج اور ہدایت میں اتنا فرق کیوں ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی مرض کی الگ الگ تشخیص بھی ہوتی ہو۔ اس خیال کے تحت ایک روز میں نے یہ پروگرام بنایا کہ اختلاج قلب کا فرضی مریض بن کر حکیم صاحب ڈاکٹر صاحب اور وید جی کے علاوہ دعا تعویذ کرنے والے شاہ صاحب سے رجوع کر کے دیکھا جائے کہ ان چاروں معالجوں کی الگ الگ کیا تشخیص ہوتی ہے۔ اس پروگرام کے مطابق میں پہلے حکیم صاحب کے یہاں پہنچا۔

حکیم صاحب گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے عرض کیا۔ حکیم صاحب میں ایک عرصہ سے اختلاج قلب کے مرض میں مبتلا ہوں۔ علاج سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تک کہ اب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں۔ لیکن حسن اتفاق سے آپ کے اعجاز مسیحائی کا شہرہ سنا تو مجھے تقویت حاصل ہوئی۔ اور بڑی امید لے کر حاضر ہوا ہوں۔ خدا کے واسطے مجھ پر توجہ فرمائی جائے۔

حکیم صاحب بہ انداز حکیمانہ سر ہلا کر بولے۔ میرے اعجاز مسیحائی کا شہرہ آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے...... ذرا ہاتھ تو بڑھائیں میری طرف...... کچھ دیر نبض سے سرگوشی کے بعد بولے۔ میں آپ کے مرض کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں

پہلو بدل کر) ..... نسخہ تو ابھی وقت لکھ دیتا۔ لیکن مناسب ہوگا کہ قارورہ بھی ایک نظر دیکھ ہی لوں تو آپ کل صبح سویرے کا قارورہ مطب میں لے آئیں۔ میں ہوا الشافی کہہ کر ایسا تیر بہدف نسخہ لکھوں گا کہ چند ہی روز میں آپ کا مرض چھو منتر ہو جائے گا۔ اگر میرا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو تو مطب میں آگ لگا کر اور اس میں عطار کو جھونک کر جنگل کا راستہ لوں گا۔

دوسرے روز قارورہ بدست حاضر ہوا۔ حکیم صاحب اپنے قریب بلا کر بولے۔ میاں قارورہ زور زور سے ہلائیں تو ..... ارے ارے اتنا زور سے بھی نہیں بھائی کہ اس کی چھینٹیں میرے منہ پر پڑیں۔

بس اسی طرح ..... ٹھیک ہے ٹھیک ہے ..... اب آپ اسے سکون کی حالت میں آنے دیں ..... اف! معاذ اللہ یہ آپ کا قارورہ ہے نہایت غیر تشفی بخش ..... چینی تو خیر کافی مقدار میں آتی ہی ہے۔ اس کے اندر چند ایسے ذرات بھی تیرتے نظر آ رہے ہیں جو خصوصاً اختلاج قلب کے مریض کے لئے بہت ہلاک ہے۔ پھر بھی گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہیں نسخہ لکھے دے رہا ہوں میری فیس جمع کر کے عطار سے پندرہ روز کی دوا بندھوالیں۔

حکیم صاحب کی تشخیص پر مجھے ہنسی آ رہی تھی خاص کر اس لئے بھی کہ وہ قارورہ میرا نہیں بلکہ میرے شیر خوار بیٹے کا تھا۔ جس میں حکیم صاحب کو ہلاک ذرات تیرتے ہوئے نظر آئے۔

مطب سے نکل کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچا۔ کمپونڈر نے پیشگی فیس جمع کر لی۔ تب ایک جونیئر ڈاکٹر نے میرا وزن لے کر مرض کی ہسٹری شیٹ تیار کی ..... گھنٹوں انتظار کے بعد میرا نام پکارا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے چیمبر میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب میرے اختلاج قلب کی ہسٹری شیٹ بغور پڑھ کر بولے۔ آپ اپنے کپڑے تو اتار ڈالیں۔ حسب ارشاد قمیص اور گنجی اتار کر ازار بند کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے ٹوکا ارے ارے اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر۔

ڈاکٹر صاحب مختلف زاویے سے میرا معائنہ کرتے رہے ..... کبھی کہتے۔ ذرا زور زور سے سانس لیں ..... یہاں ٹھیک ہے ..... اب ذرا حلق تو دکھلائیں ..... نو نو (NO- NO) ...... اتنا منھ پھاڑنے کی ضرورت نہیں بس اسی قدر کافی ہے .. .. آل رائٹ .. . اب آپ کپڑے پہن کر اس بڈ پر لیٹ جائیں۔ مائی گاڈ! یہ آپ کا جگر تو بہت بڑھا ہوا ہے۔ گیس سیریس ہے ..... آپ اپنا بلڈ یورن اور اسٹول ٹسٹ کرانے کے بعد اپنے سینے کا اکسرے بھی کرالیں۔ آپ کا ہارٹ بھی بہت ویک ہے۔ یہ چاروں رپورٹ دیکھ لینے کے بعد فائنل نسخہ لکھوں گا۔ اس بیچ ایک ٹیبلٹ دے رہا ہوں اس سے ہارٹ کنٹرول میں رہے گا

ڈاکٹر صاحب سے پیچھا چھڑا کر ویدجی کے یہاں پہنچا۔ ویدجی کی چندیا گھٹی ہوئی تھی دھوتی کے اوپر صدری پہنے ہوئے تھے۔ چشمہ ناک کی پھننگی کے اوپر لٹکا ہوا تھا۔ عینک میں سیاہ ڈورے لگے تھے جسے وہ کان کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ میرے اختلاج قلب کی کیفیت بغور سن کر بولے ——— ذرا نبض تو دیکھوں آپ کی میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی کرنٹ سا لگ گیا ان کو اپنی گھٹی ہوئی چندیا سہلا کر بولے۔ حیرت ہے کہ آپ جیوت کیسے ہیں۔ جب کہ آپ کی نبض اس طرح چل رہی ہے جیسے ٹھیل ٹھیل کے چلایا جا رہا ہو۔ یہ بہت ہی خراب لچھن ہے۔ پھر بھی یہ آپ پر بھگوان کی خاص کرپا ہے جو میرے یہاں پدھارے ہیں۔ میں جڑی بوٹیوں سے بنی ایسی دوائیں دوں گا کہ نبض کی چال جو ابھی چھکڑا گاڑی ہے وہ ریل گاڑی ہو جائے گی اور دل کی دھڑکن تو دوا کھاتے ہی جاتی رہے گی ابھی ایک ہفتے کی چالیس پڑیا دے رہا ہوں۔ اس دوا کے سیون کے ساتھ ایک دن بیچ کر کے اپنی نبض ضرور دکھلا جایا کریں۔

ویدجی نے دوا بنانے کے لئے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ میں نے جلدی سے چپل پہنی اور باہر نکل گیا۔ راستہ میں پتہ چلا کہ اپنی پرانی چپل کے بدلے ویدجی کی نئی چپل پہنے ہوئے ہوں۔ واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا اس لئے پیر سے بڑی ویدجی کی چپل پہنے سٹر پٹر کرتا ہوا دعا

تعویذ کرنے والے شاہ صاحب کے یہاں پہنچا۔ یہ میرے پروگرام کی آخری کڑی تھی۔

میرے اختلاج قلب کی پوری کیفیت سن کر شاہ صاحب نے پوچھا۔ کیا آپ ڈراؤنے خواب بھی دیکھتے ہیں ــــــ میں نے عرض کیا ۔ جی ہاں حضور۔ نہایت ڈراؤنے اور ایسے بھیانک خواب کہ جیسے کوئی مجھے کچا چبا جانے کو میری طرف بڑھ رہا ہو ہمارے دہشت کے چیخ پڑتا ہوں اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو اپنے کو بستر کی بجائے زمین پر پڑا ہوا پاتا ہوں

تو بس معاملہ بالکل صاف ہے۔ شاہ صاحب داڑھی کا خلال کرتے ہوئے بولے۔ کچھ نہیں یہ سب بلیات کا پھیرا ہے ۔ اور آپ ہیں کہ علاج کراتے پھر رہے ہیں ...... ارے بھائی کوئی بیماری ہو تب تو دوا اثر کرے ...... مگر آپ اطمینان رکھیں ۔ یہ ساری کیفیت جاتی رہے گی۔ میں ایک تعویذ دے رہا ہوں ۔ اسے گلے میں ڈال لیں۔ اور یہ ایک بوتل پانی ہے۔ اس کا ایک ایک چمچہ صبح دوپہر اور شام استعمال کریں۔ یہ پڑھا ہوا پانی ہے .... اسے حفاظت سے رکھیئے گا

میں نے شاہ صاحب کے دست مبارک سے تعویذ لے کر گلے میں ڈال لی۔ اور نذر آتے پیش کر کے حجرے سے باہر نکلتے ہی بوتل کا سارا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ کیونکہ مجھے دیر سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ تب ہی یہ دیکھا کہ شاہ صاحب کی بکری ان کے حجرے کے دروازہ پر کھڑی پاگھر کر رہی ہے ۔ میں نے تعویذ اپنے گلے سے اتار کر بکری کے گلے میں باندھ دیا اور اسے شاہ صاحب کے حجرے میں ہانکا کر اس تیز رفتاری سے بھاگا کہ اگر شاہ صاحب کا کوئی فرستادہ میرا پیچھا کرے بھی تو مجھے پکڑ نہ سکے ۔



رُونمائی یا رسم اجرار

پتا نہیں کتابوں کی رونمائی یا رسم اجراء کی ابتدا کب ہوئی اور کس ادیب یا شاعر کے کتاب کی رونمائی سب سے پہلے ہوئی میں نے شعراء ادیبوں اور دانشوروں سے دریافت کیا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی نشان دہی نہ کی۔ پھر بھی کسی نہ کسی سے اس کی ابتداء ہی ہو گی۔ اور اب تو رسم اجرا کی اس قدر اہمیت ہے کہ اگر کوئی مصنف اس سے پہلوتہی کرے تو اس کی تصنیف مستند نہ سمجھی جائے گی ...... بلکہ اس کی تصنیفی صلاحیت بھی مشکوک ہو جائے گی۔

رونمائی کے لئے عموماً کسی منتری کو زحمت دی جاتی ہے اس خیال سے کہ ان کی تشریف آوری سے کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک معقول رقم کے اعلان کی بھی توقع رہتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ ایک پہنچے ہوئے شاعر نے اپنی کتاب کی رونمائی ایک رکشہ چالک سے کرائی۔ ..... کہاں وہ بلندی اور کہاں یہ پستی لیکن ٹھہریئے۔ اس میں کوئی مصلحت ضرور ہو گی کیا عجب ہے کہ مصنف کے ذہن میں یہ بات ہو کہ جب تک رکشہ چلتا رہے ان کی کتاب بھی چلتی رہے ...... اگر واقعی اس خیال کے تحت ایسا کیا گیا تو انھوں نے بڑے دور کی کوڑی لائی۔

رسم اجرا کے لئے جو صاحب تشریف لائیں ان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ادب سے بھی کوئی تعلق ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کتاب کی رونمائی کر رہے ہیں اس کے نفس مضمون سے بھی واقفیت ہو۔ ویسے کتاب کی رونمائی کے لئے کسی منسٹر کو زحمت دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ان بیچاروں کو خود ہی دم مارنے کی فرصت نہیں رہتی۔ چہ جائیکہ کتاب،

کے مطالعہ کا وقت نکال سکیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عدیم الفرصتی کا بہانہ کرکے وہ اپنا پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے۔ اس طرح ان کی شخصیت، صلاحیت اور قابلیت پر حرف آنے کا خدشہ رہتا ہے جس کو وہ گوارہ نہیں کرسکتے۔

دروغ برگردن راوی۔ کہتے ہیں کہ ایک اعلیٰ عہدے دار تالیوں کی گونج میں جب ایک کتاب کی رونمائی کے لئے کھڑے ہوئے تو خیال آیا کہ اس کتاب کا نفس مضمون کیا ہے اور اس سلسلے میں انھیں کیا کہنا ہے۔ پہلے تو وہ بہت چکرائے۔ مگر قربان جایئے ان کی سوجھ کے انھوں نے کتاب کے ٹائٹل پیج پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ اور مسکراتے ہوئے بولے ـــــ حاضرین! میں جس کتاب کی رونمائی کے لئے کھڑا ہوا ہوں اس کے بارے میں کچھ کہنا گویا آپ حضرات کا قیمتی وقت برباد کرنا ہے۔ کتاب کی رونمائی کے بعد خود ہی پڑھ لیں گے اور جس کی جیسی صلاحیت ہوگی اس کے مطابق اپنی رائیں قائم کرسکتے ہیں لیکن قوت مشاہدہ کی کمی کے باعث بہتوں کو ٹائیٹل پیج پر بنی ہوئی تصویر کا صحیح مطلب اور مقصد سمجھ میں نہ آئے گا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کردوں...... جی ہاں ٹائیٹل پیج پر کی تصویر میں آپ یہ دیکھ رہے ہے کہ دریا کی موج لہریں مار رہی ہیں۔ اس کے کنارے ایک شخص کھڑا ہوا دریا میں چھلانگ لگانے کے قریب ہے...... یہ اشارہ اس بات کا ہے کہ خون پسینہ ایک کرکے لکھی گئی کتاب فروخت نہ ہوسکے اور پریس والوں کے تقاضے سے ناک میں دم آجائے تو مصنف کو چاہئے کہ اردو زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگاکر خودکشی کرلے۔ اور یہ ہرگز نہ سوچے کہ اس کے مرحوم ہو جانے کے بعد اس کی بیوہ اور یتیم بچوں کا کیا حشر ہوگا۔ خدا رازق ہے۔ وہ ہر حال میں روزی پہنچا سکتا ہے۔ چاہے جس طرح سے بھی ہو۔

صاحب موصوف نے اس موضوع پر ایسی دھنواں دھار تقریر کی کہ ہر طرف سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ اسی شور و شغب کے درمیان انھوں نے ایک معقول رقم کا اعلان کردیا جس کو سن کر اس قدر زور زور سے تالیاں بجیں کہ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے

پرندے ایک ایک کر کے اڑ گئے۔

رونمائی کے لئے حضرت مصنف جتنی کاپیاں لائے تھے وہ سب ہی ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات میں تقسیم ہو گئیں۔ باقی لوگوں کو اس کی ہوا تک نہ لگی۔ ان کے پلے اگر کچھ پڑے تو وہ تھے دو عدد خاستہ بسکٹ اور ایک پیالی چائے جس کا اہتمام مصنف ہی کے پیسے سے کیا گیا تھا۔

رسم اجرائی کے بعد مصنف یہ سمجھ لیتا ہے کہ کتاب بازار میں آتے ہی چھو بار اہو جائے گی لیکن جب وہ میدان عمل میں قدم رکھتا ہے تو اس کو اس قدر مایوسیوں کا سامنا ہوتا ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں...... وہ تو خدا بھلا کرے احباب اور دیگر ملنے والوں کا جو مصنف کی علمی صلاحیت اور قوت تصنیف کی تعریف کے زور پر اس کو صرف زندہ ہی نہیں رکھتے بلکہ کتابیں مفت حاصل کرتے کرتے ایک دن مصنف کو تصنیف کردہ کتابوں کے بوجھ سے ہلکا کر دیتے ہیں۔ اور ادھر اعلان شدہ معقول رقم کے حصول کے لئے دوڑتے دوڑتے تنگ آکر مصنف صبر کر کے بیٹھ رہتا ہے۔



فریدن خالہ

فریدن خالہ کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں ہر وقت پاندان رہتا فریدن خالہ کے آتے ہی ہم سبھی بچے انھیں گھیر لیتے۔ وہ اپنا پاندان کھول کر ایک موٹی سی گلوری منھ میں ڈالتیں اور پھر بٹوا سے پیسے نکال کر تقسیم کر کے کہتیں۔ "لڑکو سب اب باہر جاکر کھیلو"

فریدن خالہ کا سر سفید ہو چکا تھا۔ منھ میں ایک بھی دانت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دونوں گالوں میں اتنی گنجائش تھی کہ دو پینگ بہ آسانی سما سکیں۔ فریدن خالہ کے گلے میں تسبیح کے ساتھ دانت کھودنے کے مختلف اوزار لٹکتے رہتے تھے۔ ان کی عمر ستر سال کے اوپر ہو گی۔ لیکن تھیں ٹانٹھی ــ اور چلتی بھی خوب لپک کر۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا آتشی چشمہ لگائے رہتیں۔

فریدن خالہ نہ تو سہاگن تھیں اور نہ بیوہ۔ جوانی میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا تھا کہ جس کے نتیجہ میں سہاگن اور بیوہ کے درمیان جھول رہی تھیں۔ فریدن خالہ کا بیان ہے کہ اُن کے خوبصورت میاں ایک شب کھلی ہوئی چھت پر سو رہے تھے کہ اچانک زبردست آندھی اٹھی۔ اس آندھی میں وہ چھت کے اوپر سے جو غائب ہوئے تو پھر کہیں پتہ نہ چلا۔ فریدن خالہ کا کہنا ہے کہ اُن کے میاں کو کوئی پری لے اڑی۔ ان کو یہ ہمیشہ توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور واپس آجائیں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سفید کپڑے کبھی نہ پہنتیں۔ چوڑیوں سے کبھی ہاتھ خالی نہ رہتا۔ اپنے سہاگ کی نشانی سیندور مانگ میں ضرور لگاتیں۔ جس روز ان کے میاں آندھی میں چھت پر سے

غائب ہوئے تھے اس تاریخ کو خوب بن سنور کر ضرور بیٹھیں۔ اس اُمید میں کہ شاید آندھی میں اڑتے ہوئے گھر واپس آجائیں۔ آندھی کے آثار دیکھ کر فریدن خالہ کہتیں۔ دیکھو لڑکیو سب جن کے بادشاہ کی سواری جانے والی جب تک سواری گزر نہ جائے تم سب کوٹھری سے باہر ہرگز نہ جائیو۔

یہ بات نہ تھی کہ گھر کے بچے ہی ان کو فریدن خالہ کہتے ہوں۔ بلکہ میرے دادا اور نانا تک ان کو فریدن خالہ کہتے تھے اور چونکہ خالہ کے رشتہ میں اظہار بزرگی ہے اس لئے اپنے سے بڑی عمر والے کے سلام کا جواب دعا سے دیتیں۔ کہیں تقریب ہو میلاد شریف ہو ختنہ یا کان چھیدن ہو اور فریدن خالہ نہ جائیں یہ ناممکن تھا۔ فریدن خالہ چھینٹ کا پاجامہ اور پورے ہاتھ کی قمیص کے ساتھ دوپٹہ اوڑھتی تھیں۔

فریدن خالہ ہر جمعرات کو نور نامہ اور قیامت نامہ پڑھ کر سناتیں۔ ان کا ذریعہ معاش مشاطہ گیری تھا۔ فریدن خالہ کے پاس ایک نیلی کچیلی سی کاپی تھی۔ جس میں کنواری لڑکیوں اور کنوارے لڑکوں کے پتے لکھے ہوتے۔ فریدن خالہ کو دونوں طرف سے آمدنی ہوتی۔ جب ان کے توسط سے رشتہ طے ہو جاتا۔ مشاطہ گیری کے سلسلے میں ایک بار فریدن خالہ کو خفیحت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ جس لڑکی کی انھوں نے بات چلائی تھی اس کو گھیگھا تھا۔ فریدن خالہ نے لڑکی کی تعریف اور بڑائی کے بعد اشارۃً یہ بھی بتا دیا کہ اللہ رکھے لڑکی کو اتنا ہے ہاتھ کا اشارہ کر کے ۔۔۔ اتفاق کی بات کہ اس طرف لڑکے کو آب نزول تھا۔ فریدن خالہ کے یہ اصول کے خلاف تھا کہ وہ کسی کے عیب کی نشان دہی نہ کریں۔ اس لئے لڑکی والوں کو بھی انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے بتا دیا کہ اللہ رکھے لڑکے کو اتنا ہے۔ اس طرح دونوں گھرانے مطمئن ہو گئے اور تقریب بحسن وخوبی انجام پا گئی۔

جب لڑکی رخصت ہو کر سسرال آئی تو پتہ چلا کہ دلہن کو گھیگھا ہے۔ اور لطف یہ کہ ادھر لڑکی والے فریدن خالہ کو کوس رہے تھے کہ اس نے لڑکی کو کہاں پھنسا دیا کہ دولہا کو آب نزول ہے۔

لڑکے والوں نے فریدن خالہ کو پکڑا تو وہ اپنی صفائی میں بولیں "یہ آپ لوگ ناحق خفگی کا اظہار کر رہے ہیں جب کہ میں نے پہلے ہی صاف صاف بتا دیا تھا کہ لڑکی کو اللہ رکھے آنا ہے اور پھر جب لڑکی والوں کے یہاں بھی اس کی طلبی ہوئی تو وہاں بھی انھوں نے یہی دلیل پیش کی کہ میں نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ اللہ رکھے لڑکے کو آنا ہے۔

فریدن خالہ میرے یہاں آتیں تو مہینوں رہ جاتیں۔ گھر کے بالکل کنارے سامان رکھنے والی کوٹھری میں ان کا قیام رہتا۔ سونے سے پہلے نعت اور حمد ضرور پڑھتیں۔ اس کے بعد کلمۂ شہادت بھی۔ یہی ان کا معمول تھا۔ ایک روز کسی ضرورت سے دادی اماں فریدن خالہ کی کوٹھری میں گئیں صبح کی نماز پڑھ کر خالہ بے خبر سو رہی تھیں۔ دادی اماں کے بار بار آواز دینے پر بھی جب وہ نہ اٹھیں۔ تو دادی نے انھیں ہلا کر جگانا چاہا۔ لیکن یہ کیا۔ فریدن خالہ تو اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اس خبر سے گھر کے اندر کہرام مچ گیا۔ فریدن خالہ کو سفید چادر اوڑھا کر ان کے سرہانے اگر کی بتی جلا دی گئی۔ اور تجہیز و تکفین کی تیاری ہونے لگی۔ کفن بھی سل گیا۔ صرف میت کو غسل دینا باقی تھا کہ فریدن خالہ کے کلمہ پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ہم لوگ چیخ مار کر بھاگے۔ فریدن خالہ کی آواز سن کر نانا جان جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئے تو فریدن خالہ نے پوچھا۔ میر صاحب گھر کے اندر اتنا ہب غب کاہے کا ہے۔ کوئی کاج ہے کیا۔

جب فریدن خالہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا گیا تو خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ میں ایک زمانہ سے آ رہی ہوں میر صاحب مگر کسی کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ مشق کرتے کرتے اب دو گھنٹے تک سانس روک لے سکتی ہوں ...... یہ اچھا تماشہ ہے کہ مجھے مردہ سمجھ کر کفن سل گیا اور قبر بھی کھد گئی۔ وہ تو تھوڑی دیر اور اگر سانس رکے رہتی تو دفن ہی کر دی جاتی ...... نا بابا نا ...... میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ کون جانے وہ کب لوٹ کر آجائیں ـــــ یہ کہہ کر فریدن خالہ نے اپنا پاندان سنبھالا اور کلمہ پڑھتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ اس دن کے بعد سے کسی نے فریدن خالہ کی صورت نہ دیکھی۔ اور اب تو وہ مر کھپ بھی گئی ہوں گی۔



دوزخ سے براڈ کاسٹنگ

گھر گھراہٹ اور پھر بھاری بھرکم آواز ...... ہم دوزخ ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے خبریں سنیں۔ اور اب ایک خصوصی پروگرام کے تحت چند دوزخیوں سے لی گئی انٹرویو کی ریکارڈنگ سماعت فرمائیں گے۔

گھر گھراہٹ اور پھر آواز ..... اس وقت اسٹیڈیو میں ایک پنڈت جی۔ ایک مولوی صاحب۔ ایک نوجوان اور ایک پہلوان تشریف فرما ہیں ہیں سب سے پہلے پنڈت جی سے گزارش کر رہا ہوں کہ وہ خود ہی سامعین سے اپنا تعارف کرائیں نام بھی بتا کر یہ وضاحت کریں کہ کس پیشے سے دنیا میں تعلق تھا اور یہ بھی کہ نرکھ میں کیسے آنا ہوا۔

پنڈت جی کی آواز ـــــ کیا بتاؤں مجھے اپنا نام بتاتے میں شرم آتی ہے۔ خاص کر اس خیال سے بھی کہ ممکن ہے دنیا والے بھی یہ پروگرام سن رہے ہوں۔ ویسے پنڈت جی ہی کے نام سے مشہور تھا۔ پیشے کے اعتبار سے میں دوائیں فروخت کرنے کا کاروبار کرتا تھا۔ میں نے ایک کارخانہ بھی کھول رکھا تھا جس میں جالی دوائیں اور جالی انجکشن تیار کئے جاتے تھے میری اس جالسازی سے ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ لیکن میری تجوری میری اس حکمت عملی سے بھرتی رہی اور میں بہت خوش تھا کہ کس صفائی سے جنتا کو دھوکا دے کر اپنا الّو سیدھا کر رہا ہوں لیکن کیا خبر تھی کہ ایک دن اپنی اس جالسازی کا خود بھی شکار ہو جاؤں گا ...... ہوا یہ کہ ایک روز حسب معمول دوکان سے لوٹا ہی تھا کہ اچانک زوروں کا بخار چڑھا۔ ڈاکٹروں نے میری ہی کمپنی کی تیار کردہ جالی دوا کا انجکشن لگایا ہی تھا کہ میں نے دم توڑ دیا۔ ...... تب سے نرکھ میں یہ سزا بھگت رہا ہوں کہ دن رات میں سینکڑوں مرتبہ اسی جالی دوا کا انجکشن مجھے

لگایا جاتا ہے ...... ہائے میرا پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے .... اور اب تو مجھ سے بولا بھی نہیں جاتا۔

آواز ـــــ اور اب مولوی صاحب اپنا اسم گرامی بتاکر یہ فرمائیں کہ کس کارنامہ کے تحت اس غیر متوقع جگہ تشریف لانا ہوا جناب کا۔

مولوی صاحب کی آواز ـــــ مجھے بھی پنڈت جی مہراج کی طرح نام بتلانے میں حیا دامن گیر ہوتی ہے۔ ویسے دنیا میں جنت کے ٹھیکے دار کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہئیے کہ یہ اس مولویانہ شکل وصورت میں پورا دنیا دار تھا۔ میری نمازیں گنڈے دار ہوتیں۔ اور روزے دنیا والوں کو دکھلاتے کو۔ خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنے کیلئے دوسروں کو نصیحت کرتا مگر اپنا یہ حال کہ کسی کا مرغ یا بکرا بھٹک کر گھر کے اندر آجاتا تو بلا تکلف چٹ کر جاتا۔ چار بیبیاں اپنے عقد نکاح میں تھیں۔ لیکن اُن کے نان ونفقہ سے ہمیشہ غافل رہا۔ یتیم اور بیواؤں کی امانت ہڑپ کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ میری انتہائی بخالت کا یہ عالم کہ خرچ کے ڈر سے اپنی اولاد کو تعلیم وتربیت سے محروم رکھا۔ وغیرہ وغیرہ ...... اور آج انھیں کردہ گناہوں کی پاداش میں جہنم کا کندہ بنا ہوا اسے بھگت رہا ہوں۔

آواز ـــــ اور اب مسٹر آپ اپنے تعارف کے بعد یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ کس کارنامہ کے پاداش میں آپ دوزخ میں رونق افروز ہیں۔

نوجوان کی آواز ـــــ میں زیادہ تفصیل میں نہ جاکر یہ عرض کروں گا کہ میری شادی میں میرے خسر رنگین ٹی وی نہ دے سکے تو میں نے بارات واپس لے جانے کی دھمکی دی تو میرے ہونے والے خسر نے میرے پیر پہ اپنی ٹوپی رکھ کر مجھ سے عزت کی بھیک مانگی۔ ان کو گڑگڑاتے دیکھ کر میرے اندر کا سویا ہوا انسان جاگ گیا۔ اور ٹی۔ وی لئے بغیر بیوی کو رخصت کرا لایا لیکن اس کے چند ہی روز بعد میرے اندر سوئے ہوئے انسان صفت حیوان نے سر اٹھایا اور حصول ٹی۔وی کے لئے اپنی معصوم اور بے قصور بیوی کو اذیت پہ اذیت دینے لگا۔ جب اس پر بھی کوئی مناسب راہ نہ نکل سکی تو ایک دن طیش میں آکر اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لئے اسے گہری

نیند سلا دیا۔ لیکن بدقسمتی سے قانون کی گرفت میں آگیا اور پھانسی پا کر واصل جہنم ہوا۔ تب سے ہر تھوڑی تھوڑی دیر پر ٹھیک اسی طرح میرا گلا گھونٹا جاتا ہے جس طرح اپنی بے قصور بی بی کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کو تو خیر موت بھی آگئی۔ لیکن یہاں بار بار گلا گھونٹے جانے پر موت نہیں آتی۔ حالانکہ ہر وقت موت کو پکارتا رہتا ہوں۔

آواز ——— اور اب اس پروگرام کے آخر میں آپ بھی پہلوان اپنے مختصر حالات سے آگاہ کریں۔

پہلوان ——— میرا نام تو ضمیر یوں ہی سا تھا لیکن کافی تندرست ہونے کی وجہ سے پہلوان کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے میں مکھن فروش۔ خالص مکھن فروخت کیا کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ میرے اندر بددیانتی نے گھر کرنا شروع کیا۔ اور اصلی گھی میں ڈالڈا ملا کر بیچنے لگا۔ اس بے ایمانی فریب اور دغا بازی سے خوب دھن بٹورنے لگا۔ اگر مکھن میں ملاوٹ کی شکایت ہوتی تو خدا کی پکڑ سے بے نیاز اپنے گاہکوں کو الٹا سیدھا سمجھا کر مطمئن کر دیا کرتا۔ مکھن میں ڈالڈا ملا کر فروخت کرنے کا دھندا سالہا سال تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میری عمر کے دن پورے ہوئے۔ اور چند ہی روز کی علالت کے بعد انتقال کر گیا۔ یہاں آتے ہی میرے سر پر ایسا گرز پڑا کہ میں پاش پاش ہو گیا۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ دوزخ میں عذاب کا فرشتہ مجھے مکھن کے تالاب میں غوطہ دے کر باہر نکالتا ہے اور دوسرا فرشتہ میرے سر پر گرز مار کر پاش پاش کر دیتا ہے۔ مگر فوراً پھر اصلی حالت میں آجاتا ہوں۔ کھانے کو سڑا ہوا ڈالڈا آمیز مکھن ملتا ہے جسے بہ مشکل حلق سے فرو کرتے ہی قے کر دیتا ہوں۔ لیکن میری قربہی میں کمی نہیں آتی .... نہ معلوم عذاب کا یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔

گھرگراہٹ .... اور پھر ایک بھاری بھرکم آواز .... سامعین دوزخ میں مقیم چند صاحبان سے لی گئی انٹرویو کی ریکارڈنگ ختم ہوئی اب آپ چھنی بھری باتی سے جگر مرادآبادی کی وہ غزل سماعت فرمائیں جس کا مطلع ہے ؎

آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی

خدا بچائے ایسے شاعر سے

کیا خبر تھی کہ سامنے والے مکان میں جو کرائے دار آ رہے ہیں وہ میرے لئے دردِ سر ثابت ہوں گے۔ وہ حضرت دوسرے ہی روز صبح سویرے میرے غریب خانہ پر تشریف لائے اور پُر خلوص انداز میں مصافحہ کر کے بولے مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔ خاص کر اس لئے بھی کہ سنتے میں آیا ہے کہ آپ کو شعر و شاعری سے کافی ذوق ہے۔ یہ ناچیز بھی آپ کی دعا سے پیدائشی شاعر ہے جس کو انگریزی میں BORN poet کہتے ہیں۔ کڑک تخلص کرتا ہوں۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ تو لیجئے ایک پھڑکتی ہوئی غزل سنا ہی دیتا ہوں۔

جناب کڑک نے جیب سے بیاض نکالی۔ اُلجھے ہوئے بال کو اور الجھا کر ترنم سے غزل سرا ہوئے۔ ان کے ترنم کا یہ عالم تھا کہ جیسے نرسنگھا پھونکا جا رہا ہو۔ ایک ایک شعر بار بار پڑھتے اور مقطع تک پہنچتے پہنچتے دوسری غزل شروع کر دیتے۔ جب وہ چوتھی غزل بھی شروع کرنے والے تھے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا میں نے دست بستہ معافی مانگی تب وہ بیاض جیب میں رکھ کر بولے۔ اچھا تو میں شام کو پھر آ جاؤں گا۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

دفتر سے آنے پر معلوم ہوا کہ جناب کڑک ڈرائنگ رُوم میں میری قیمتی شال اوڑھے چار ہی بجے سے میرے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور مانگ مانگ کر چار پیالیاں چائے پی چکے ہیں۔ اور ابھی ابھی ناشتہ بھجوانے کی بھی فرمائش کی گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔۔ ارے صاحب اتنا دیر کر کے دفتر سے آتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آ گئے یہی غنیمت ہے۔۔۔۔۔ بھئی آپ کی یہ شال اس قدر گرم ہے کہ اس کی گرمی سے ایک گرما گرم غزل ہو گئی ہے۔ اس تمہید کے بعد جو وہ غزل سرا ہوئے تو ان کی رفتار غزل خوانی میں بریک لگاتے لگاتے بھی دس بج گئے۔ الغرض بہ مشکل اپنی

بیاض بند کر کے بادل ناخواستہ اٹھے اور میری شال اوڑھے ہوئے باہر نکل گئے ۔

دو بجے شب میں دروازہ پیٹے جانے کی آواز سن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ حضرت کڑک کھڑے ہیں ۔ وہ بولے ۔ ارے بھئی یہاں سے جانے کے بعد بستر پر لیٹا تو ایک پھڑکتی ہوئی غزل ہو گئی ۔ بیگم سو چکی تھیں ۔ انھیں جگا کر غزل سنا ہی رہا تھا کہ چلیبوٹی کاٹ کر انھوں نے اپنے شیر خوار بچے کو جگا دیا ۔ اس پلّے نے اپنی مادری زبان میں قصیدہ خوانی جو شروع کی تو اسے اپنی شاعری کی توہین سمجھ کر آپ کے ایسے قدرداں کو غزل سنانے چلا آیا ہوں ...... جی ہاں میں نے عرض کیا ہے مطلع ملاحظہ ہو ۔ توجہ چاہوں گا ۔

اب وہ حضرت بلاناغہ صبح ہوتے ہی غزلیں سنانے چلے آتے ۔ ان سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر طلوعِ آفتاب کے پہلے ہی گاندھی گھاٹ کی طرف ٹہلنے نکل جاتا ۔ کڑک صاحب حسبِ معمول آتے اور دروازہ پیٹ کر چلے جاتے ۔ لیکن ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کڑک اپنی بیاض لئے گاندھی گھاٹ پر موجود ہیں .... مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر بولے ۔ ارے صاحب میں تو آپ ہی کا منتظر تھا ۔ آج طلوعِ آفتاب پر ایک شاندار نظم سناؤں گا ۔ اس نظم کا لطف دوبالا ہو جائے گا ۔ جب آپ میری تخلیق کردہ نظم کے ساتھ طلوعِ آفتاب کا منظر بھی دیکھ رہے ہوں گے ...... یہ سن کر جی میں آیا کہ کڑک صاحب کو لے کر دریا میں چھلانگ لگا دوں ۔ لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے میں ذرا قباحت تھی ۔ اس لئے مناسب صورت یہ نظر آئی کہ دل پر جبر کر کے ان کی طلوعِ آفتاب والی نظم سن ہی لی جائے ۔ اگر نظم سننے کے دوران میرا ہارٹ فیل ہو گیا تو اس سے بڑھ کر اور کیا آسانی ہو سکتی ہے ۔ لہٰذا حضرت کڑک جب تک نظم سناتے رہے میں توبہ استغفار کرتا رہا لیکن دانے تقدیر ۔ میں اس درجہ سخت جان ثابت ہوا کہ جناب کڑک کی نظم ختم ہو گئی مگر میں ختم نہ ہوا ۔

ایک دن حضرت کڑک اس ہیئت سے آتے دکھائی دیئے کہ ایک طفلِ شیر خوار گود میں تھا ۔ اور ایک ان کی شہادت کی انگلی پکڑے ہوئے بمشکل چل سکتا تھا ۔ میرے قریب آتے ہی بولے ۔ دیکھا ہاشم صاحب آپ نے میں ہوں کہ راتوں کی نیند حرام کر کے غزلیں کہوں ۔ اور بیگم

کی انتہائی بد ذوقی ہے کہ غزل سننا بھی گوارا نہ کریں ..... اور آج تو انھوں نے حد ہی کردی میں اپنی تازہ غزل باورچی خانہ میں بیٹھ کر سنا رہا تھا کہ بیگم غصہ میں اٹھیں اور پیر پٹکتی ہوئی اپنی یہ دونوں تخلیق چھوڑ کر میکے چلی دیں ..... تو جب وہ میری تخلیق کردہ غزلیں برداشت نہیں کرسکتیں۔ تو میں ان کی تخلیق کیسے برداشت کرسکتا ہوں .... لہذا بیگم کی یہ دونوں تخلیق ان کے حوالہ کرنے جا رہا ہوں۔

جناب کڑک کے تشریف لاتے اور غزلیں سناتے کا سلسلہ چلتا رہا۔ اب میں ان کے اشعار سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک روز کڑک صاحب کے دروازے پر ایک سائن بورڈ لٹکا ہوا نظر آیا۔ جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "یہاں قلیل معاوضہ پر اصلاح سخن کا کام ہوتا ہے غزلیں بذریعہ ڈاک بھی ارسال کی جاتی ہیں۔

اس سائن بورڈ سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حضرت کڑک پابندی سے نہ آتے۔ اب وہ اصلاح لینے والے شعراء کے انتظار میں گھڑیاں گنتے یا فکر سخن میں منہمک رہتے.. ... اور اگر آتے بھی تو کہتے ـــــ کیا بتاؤں دم مارنے کی فرصت نہیں رہتی۔ صبح سے شام تک اصلاح لینے والوں کا ہجوم اور اس پر سے روزانہ ڈاک سے موصول ہونے والی غزلوں کی بھرمار۔ ایک میری اکیلی جان۔ کروں تو کیا۔ اگر کام کا ایسا ہی ہجوم رہا تو کسی ایک کہنہ مشق شاعر کو بحال کرنا پڑے گا۔

ایک روز جناب کڑک کے دروازے پر آدھی رات کے قریب ٹیکسی کے رکنے اور کچھ سامان اندر باہر کرنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کڑک صاحب کے یہاں مہمان آئے ہوں گے۔ لیکن دوسرے دن صبح کو اُن کے مکان میں تالا لگا ہوا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آخر کڑک صاحب معہ فیملی راتوں رات کہاں چلے گئے۔

اس کے پندرہ روز بعد ایک سادھو جی نے مجھ سے پوچھا۔ ایجی بابو صاحب یہ آپ کے سامنے والے مکان کے کرایہ دار کہیں باہر گئے ہیں کیا۔ جب بھی آتا ہوں تو تالا لگا ہوا دیکھ کر لوٹ جاتا ہوں ...... بات یہ ہے حضور کہ یہ ادبی شال سو روپے میں دو دن کے

وعدے پر میرے یہاں گروی رکھ گئے تھے لیکن ابھی تک اُسے چھڑانے نہیں آئے ہیں۔ یہ وہی شال تھی جسے کڑک صاحب مالِ غنیمت سمجھ کر لے گئے تھے۔

سادوجی اپنا دکھڑا رو ہی رہے تھے کہ جناب کڑک کے مکان مالک ادھر نکلتے نظر آئے۔ انہوں نے مکان میں تالا لگا ہوا دیکھا تو ادھر ادھر جھانک کر بولے۔ ارے مکان تو بالکل خالی پڑا ہے۔ میرا دس ماہ کا کرایہ لے کر بھاگ گئے کیا مولوی صاحب

اس نے انتہائی غصہ میں تالا توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی مکان میں داخل ہوا اندر کوئی سامان نہ تھا۔ دیواروں پر جابجا کوئلے سے اشعار لکھے تھے۔ اور جناب کڑک کی بیاض چولھے کے پاس پڑی تھی۔ جو عجلت میں گر گئی ہوگی۔ اُسے اٹھا کر ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ اگر یہ شعری مسودہ اردو اکیڈمی نے منظور کر لیا تو کم از کم میرے اونی شال کی قیمت تو ضرور ہی نکل آئے گی۔



فادرس ٹریننگ سنٹر

ایک وسیع ہال میں سیکڑوں بچے جمع ہیں۔ سب ہی دو سال کے اندر ہیں۔ کوئی بچہ کسی کو دھکے دے رہا ہے کوئی ٹافی چھین رہا ہے تو کوئی کسی کا منھ نوچ رہا ہے۔ اس شور و غل کے درمیان ماسٹر گڈو مائک پر اعلان کرتا ہے ...... دوستو! ایک کانفرنس کی کارروائی شروع ہونے والی ہے اس لئے کسی بچے کو انگوٹھا چوسنے یا ٹافی کھانے کی اجازت نہ ہوگی ہاں جو بچے رونا چاہیں وہ تھوڑی دیر رو کر تفریح طبع کر لیں۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر ماسٹر گڈو کی آواز مائک پر گونجتی ہے اب جب کہ سارے ڈیلیگیٹ بچے ٹافی کھانے۔ روتے اور انگوٹھا چوسنے سے فارغ ہو چکے ہیں تو اب کانفرنس کی کارروائی شروع کرتے ہوئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے کانفرنس کی غرض وغایت کی وضاحت کر دی جائے۔

یہ تو سب ہی بچے جانتے ہیں کہ کسی بھی محکمہ کارخانہ یا فیکٹری میں اس وقت تک ملازمت نہیں مل سکتی۔ جب تک کہ امیدوار میں اس کام کے انجام دینے کی صلاحیت نہ ہو۔ تو کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں کہ شادی ایسے اہم معاملات میں کسی کے ٹرینڈ یا انٹرینڈ ہونے کا سوال ہی نہ اٹھایا جائے اور صرف حسب ونسب دریافت کر کے صاحبزادے کو دامادی ایسے عہدۂ جلیلہ پر بحالی کے لئے منتخب کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے کنڈیڈیٹ صاحب اولاد ہو کر بچوں کی تربیت و پرداخت اس معیار پر نہیں کر سکتے جس کی توقع ایک ٹرینڈ فادر سے کی جا سکتی ہے۔ مقام حیرت ہے یارو کہ ابھی تک ہمارے بزرگوں کے ذہن میں ایک ایسا اسکول یا سنٹر قائم کرنے کا خیال ہی نہ آیا جس میں شادی کے قبل صاحبزادے کو مناسب

اور ضروری ٹریننگ دی جائے۔ لہٰذا اس کمی کے پیش نظر میں نے ضرورت محسوس کی کہ اپنی اجتماعی کوششوں کے بل پر فادرس ٹریننگ سنٹر کی بنیاد ڈال دی جائے۔۔۔۔۔ تو وہی اس جانب عملی قدم اٹھانے کے قبل اس کے ہر پہلو پر غور کرنے کے لئے یہ کانفرنس بلائی گئی ہے الحمد للہ کہ میری ایک آواز پر یہ وسیع ہال شیر خوار بچوں سے بھرا نظر آرہا ہے۔۔۔۔ تو سب سے پہلے منے میاں سے درخواست کروں گا کہ تشریف لاکر اپنے خیالات سے نوازیں۔

منے میاں انگوٹھا چوس رہے تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھے تو جیب سے ٹافی گر گئی۔ جسے اٹھا کر ایک نیچے نے منھ میں ڈال لیا۔ ننے میاں کمزور پڑتے تھے۔ خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ اور ہلکتے ہوئے بولے۔

دوستو ابھی ابھی گڈو بھائی نے کانفرنس کی غرض و غایت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اسکیم کس قدر اہم ہے۔ فادروں کے انٹرینڈ رہنے کی وجہ سے ہم شیر خواروں کی جو درگت ہوتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ (انگوٹھا چوس کر)۔۔ ۔۔۔۔ دوستو ہمارے وہ بھائی جو عالم وجود میں آنے کو لائن لگائے ہوئے ہیں وہ بھی انٹرینڈ فادروں کے ہاتھوں ہماری ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوں گے۔ اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہوسکے فادرس ٹریننگ سنٹر کھول کر مستقبل کے لئے راہ ہموار کردی جائے۔

اب ماسٹر بو بی تشریف لائیں۔ گڈو میاں نے آواز دی ــ ماسٹر بو بی انگوٹھا چوس رہے تھے۔ وہ اٹھے تو سبھی لیکن مشکل یہ آپڑی کہ پینٹ میں پیشاب کر چکے تھے۔ مجبوراً بھیگے ہوئے پینٹ کو اتار کر صرف قمیص پہنے ہوئے ڈائس پر آکر بولے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے دوست مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں جیسے وہ کبھی پینٹ میں پیشاب کرتے ہی نہیں۔ مجھ پر ہنسنا تو انھیں تب ہی زیب دیتا جب خود ان کے اندر یہ کمزوری نہ ہوتی۔۔۔ بہر حال یہ عرض کروں گا کہ فادرس ٹریننگ سنٹر کھولنے والی تجویز وقت کی ایک اہم پکار ہے۔ جس پر منے بھائی نے ابھی ابھی عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ انھیں باتوں کو دہرا کر آپ کا قیمتی وقت برباد نہ کر کے پُرزور سفارش کروں گا کہ اس اسکیم کو ہر قیمت پر عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس میں ڈسپلین پر کافی زور دیا جائے۔ کیونکہ صحیح معنوں

ہیں ڈسپلین تو ہم بچوں ہی کے اندر ہوتی ہے ۔ ہمارے بزرگوں میں یہ صفت کہاں ۔ وہ تو جب سنو یہی کہیں گے ۔ بیٹا یہ مت کرو ۔ بیٹا وہ مت کرو ۔ دراصل انٹر بینڈ فادر ہونے کی وجہ سے ہم بچوں پر صرف جمانا ہی جانتے ہیں اور پرورش و پرداخت کی صلاحیت قطعی نہیں رکھتے لیکن فادرس ٹریننگ سنٹر کھل جانے کے بعد یقیناً یہ صورت حال نہ رہے گی ۔ ... ظاہر ہے کہ لڑکی والے ہمارے سنٹر کے ٹرینڈ امیدواروں کو دامادی کے عہدے کے لئے ترجیح دیں گے اور ہاں ایک تجویز اور ہے وہ یہ کہ شادی شدہ حضرات کو بھی ٹریننگ دی جائے جو صرف ایک سال کی ہو ۔ لیکن غیر شادی شدہ یعنی کنواروں کی مدت ٹریننگ تین سال لازمی قرار دی جائے اور ہم بچوں کو پورا اختیار حاصل ہو کہ دوران ٹریننگ اگر وہ شرارت کریں تو ہم انہیں بنچ پر کھڑا کر سکیں ۔ اور ضرورت محسوس ہونے پر ہم انہیں کلاس میں مرغا بھی بنا سکیں ۔

اور اب چینو میاں تشریف لاکر اظہار خیال فرمائیں ۔ ماسٹر گڈو نے آواز دی ۔ ماسٹر چینو روتے روتے سو گئے تھے ۔ اٹھائے جانے پر اماں اماں کہہ کر رونے لگے لیکن جب کانفرنس میں موجودگی کا احساس ہوا تو انگوٹھا چوس کر بولے ۔

دوستو ۔ کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا ...... اور بن کہے رہا بھی نہیں جاتا .... تو قصہ مختصر یہ ہے یارو کہ کل رات امی اور ابی نہ جانے کس بات پر رات بھر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے وہ تو کہئے کہ نعمت خانہ کھلا تھا جس میں سے میں نے چند رس گلے اڑا لیئے ۔ اور ٹانیاں جیب میں ڈال کر کانفرنس میں شرکت کے لئے چلا آیا ہوں ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھ جھپک سی لگ گئی تھی .... تو دیکھا آپ نے ایسے ہوتے ہیں انٹر بینڈ فادر جنہیں اتنی بھی واقفیت نہیں کہ بچے ماں باپ کے اخلاقی اور غیر اخلاقی کردار کا نمونہ ہوتے ہیں ۔ ان کے سامنے اچھے اخلاق کا نمونہ ہمیشہ پیش کرنا چاہیے .... حاصل کلام یہ کہ یہ چکر ہمیشہ یوں ہی چلتا رہے گا ... جب تک کہ ہم بچے ہونے والے فادروں کی اصلاح کے لئے سینہ سپر نہیں ہوتے ۔ لہذا اس اسکیم کو عملی جامہ پہنا کر یہ ثابت کردیں کہ جس کام کو ہمارے بزرگ نہ کر سکے اسے ہم شیر خوار بچوں نے کر کے دکھلا دیا ۔ جو ان کے لئے باعث شرم ہے ۔

اسٹرچو کے بیٹھ پھرتے ہی گڈو نے اپنی صدارتی تقریر شروع کی۔۔۔

دوستو۔ یہ مقام مسرت ہے کہ ہمارے سب ہی ساتھیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ فادرس ٹریننگ سنٹر فوراً اسٹارٹ کیا جائے۔ اس طرح یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ اب رہا اس کے نئے رول ریگولیشن تو ابتدائی اسٹیج میں یہی کافی ہوگا کہ اس ادارے میں برائے ٹریننگ داخل ہونے والوں پر ہم معلم بچے کڑی نگاہ رکھیں۔ انھیں ہڑتال کرنے اور ہم بچوں پر رعب جمانے کا اختیار نہ ہوگا۔ کلاس میں انھیں صاف پینٹ اور ریلو ٹائی لگاکر آنا ہوگا۔ انھیں قطعی اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ ہمارے سامنے سگریٹ نوش کریں۔ ٹریننگ کی فیس اسٹوڈنٹ کی مالی حالت پر منحصر ہوگی۔ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں ان کا میڈیکل ٹسٹ ہوا کرے گا جس کا باضابطہ ریکارڈ رکھا جائے گا۔ لڑکی والوں کی اجازت ہوگی کہ ہماری مطلوبہ فیس ادا کرکے ہمارے رجسٹر سے سند یافتہ صاحبزادگان کا انتخاب کرکے براہ راست گفتگو کریں۔ تقریب انجام پا جانے کے بعد لڑکی والوں کا یہ اخلاقی فرض ہوگا کہ فادرس ٹریننگ سنٹر کے بوائز فنڈ میں مبلغ پانچ سو ایک روپیہ جمع کریں۔

اب رہا فادرس ٹریننگ سنٹر کھولنے کے لئے فنڈ کا اہتمام تو اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ وہ سب ہی بچے جو ڈبے کا دودھ پیتے ہیں ہر ماہ دو ڈبہ دودھ بچا لیا کریں اور اس سے حاصل شدہ رقم ہمارے فنڈ میں جمع کرتے جائیں۔ ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں۔ اگر مشکل ہو تو بھی تھوڑی قربانی کرنی ہوگی۔ کیونکہ بغیر قربانی کے آج تک کوئی بڑا کام انجام نہیں ہوا ہے۔ میں بذات خود ہر ماہ دو ڈبہ دودھ بچا لینے کا اعلان کرتا ہوں چاہے ایسا کرنے میں میری صحت پر برا اثر ہی کیوں نہ پڑے ...... اوہ میں دیکھ رہا ہوں آدھے سے زیادہ بچے سو گئے۔ بہتوں نے پینٹ میں پیشاب کر دیا ہے ..... اور کچھ بچے ایسے بھی ہیں جو اماں اماں کہہ کر رو رہے ہیں ..... لہٰذا اب کانفرنس کی کارروائی ختم کی جاتی ہے ۔۔

معاف کیجئے گا

ہے تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ لیکن افادیت کے لحاظ سے کوئی بڑا سے بڑا جملہ اس کے ٹکر میں نہیں آسکتا۔ کم از کم میں تو اس کی افادیت کا قائل ہوں کیونکہ اس کی گوناگوں کرشمہ سازیاں اور مشکل کشائیاں میں نے دیکھی ہیں۔ ایک واقعہ تو آج بھی میرے ذہن میں اس طرح تازہ ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

میں دفتر سے آرہا تھا۔ ایک صاحب مجھ سے کچھ آگے چل رہے تھے۔ وہ بار بار پیچھے کی جانب مڑکر دیکھتے اور پھر تیز تیز قدموں سے چلنے لگتے۔ ایک بار جو انھوں نے منھ پھیرا تو میں چونک پڑا۔۔۔۔ ارے یہ تو میرے کالج کا ساتھی ہے جو ملازمت کے سلسلہ میں ایک عرصہ سے باہر تھا۔ یقیناً یہ کمبخت مجھے دیکھ کر مٹیا رہا ہے یہ خیال آتے ہی میں نے دل میں کہا۔ اچھا بچو۔ انجان بن کر مذاق اڑانے کا وہ مزہ چکھاؤں گا کہ کچھ دن یاد کرو گے۔ پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ کر ایک زناٹے دار چپت پیچھے سے رسید کیا۔ اور اب جو دیکھتا ہوں تو وہ حضرت کوئی اور ہی شخص تھے۔ اس اچانک حملہ سے ان کے ہوش بجا نہ رہے تھے۔ پھر بھی سنبھل کر جوابی حملہ کرنے ہی والے تھے کہ میں نے جلدی سے کہا۔ معاف کیجئے گا۔۔۔۔

ایک بے تکلف دوست کے شبہ میں یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی۔۔۔۔۔۔ وہ حضرت قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے لیکن جب تک میرا اور ان کا سامنا رہا وہ اپنا سر سہلاتے ہی رہے۔

میں کراچی گیا ہوا تھا۔ سیر کی غرض سے اسکوٹر لے کر نکلا۔ لیکن واپسی میں راستہ بھول گیا ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو قریب ہی کھڑا دیکھ کر میں نے پوچھا۔ اسٹیشن روڈ کا راستہ ادھر ہی کو جاتا

ہے ماموں: اس کے جواب میں ہوا میں گھونسہ چلاتے ہوئے وہ بولے۔ تمہارا ماموں ہوگا کوئی اور حرام زادا۔ ٹھہرو ابھی مزہ چکھاتا ہوں کسی کو سر راہ ماموں کہنے کا ــــ لیکن قبل اس کے کہ وہ مزہ چکھانے کو آگے بڑھیں۔ میں نے کہا ــــ معاف کیجئے گا۔ دراصل مجھے چچا کہنا تھا عجلت میں ماموں کہہ کر مخاطب کرنے کی گستاخی مجھ سے سرزد ہوگئی .... یہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ــ اور وہ حضرت مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ دوسرا واقعہ بھی کراچی ہی کا ہے میں کسی سڑک سے گزر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک بزرگ نے مجھے آدبوچا۔ اور بزرگانہ شفقت کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ اب یہ حالت ہوگئی طوطا چشمی اور بد اخلاقی کی کہ بشیر کا لڑکا کراچی آئے۔ اور مجھ سے ملے بغیر چلا جائے .... میں نے بھونچکا ہو کر عرض کیا۔ معاف کیجئے گا میں تو جناب نظیر..... ہاں ہاں وہ جھٹ سے بولے۔ نظیر، بشیر، ظہیر..... یہی نا کہنا چاہتے ہو تم .... معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کرنے لگے ہو۔ تب ہی تو یہ قافیہ بندی ہے۔ اور پھر رونی صورت بنا کر بولے ؎ ہائے میرا دوست بشیر بے وقت بچھڑ گیا مجھ سے ابھی تک مرحوم کی شکل آنکھوں میں گھومتی ہے جس کی ہو بہو تصویر تم ہو۔ خدا انہیں جیات کا ٹھا کرے۔ میں نے پھر ہمت کر کے عرض کیا۔ معاف کیجئے گا۔ میں تو جناب سید نظیر حسن .... ہاں ہاں۔ وہ اپنی گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے بولے۔ میں خوب سمجھتا ہوں تم اپنا پیچھا چھڑانے کو بہانے تراش رہے ہو۔ لیکن عزیزم اس سے کام چلنے کا نہیں۔ تمہیں اپنے گھر لے جا کر کچھ کھلانے پلانے کے بعد ہی چھٹی دے سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ جہاں ان کی اہلیہ ٹی وی پر پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر جانے لگیں تو میرے بزرگ چچا بولے۔ اجی بھاگی کہاں جا رہی ہو بیگم۔ یہ تو بشیر کا وہی لڑکا ہے جس کو تم ہر وقت گود میں لئے پھرا کرتی تھیں۔ آج سے وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ محترمہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور ادھر میرے چچا نے نعمت خانہ کھولا۔ کیک بسکٹ اور رس گلے نکال کر میرے آگے رکھا اور دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔ لو کھاؤ۔ شروع کرو۔ شرمانے کی ایسی تیسی۔ اگر پھر تم نے معاف کیجئے گا کی رٹ لگائی تو

مجبوراً مجھے تمہاری گوشمالی کرنی پڑے گی۔

ابھی بہ مشکل ایک رس گلہ ہی حلق سے نیچے اتارا تھا کہ دروازے پر چوڑیاں جھنجھنائیں۔ اور ساتھ ہی زنجیر کی ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ میرے فرضی چچا استغفر اللہ کہہ کر اٹھے اور بولے۔ واللہ ناک میں دم کر دیتی ہو بیگم تم بھی۔ بھلا یہ کون سا موقع تھا مجھے اندر بلانے کا۔۔ ...... تو عزیزم میں ابھی آیا۔ میرے واپس آنے تک تشتری صاف ہو جانی چاہیئے ...... ورنہ۔۔

دوسرے کمرے سے کھسر پھسر کی آواز ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میرے چچا بھلاتے ہوئے باہر نکل کر بولے۔ معاف کیجیے گا۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔

اُن کی اس غلط فہمی اور شرمندگی سے فائدہ اٹھا کر باقی بچے ہوئے دو کیک بھی اپنی جیب میں ڈال کر میں نے کہا ــــ معاف کیجیئے گا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ معاف کیجیئے گا۔

معاف کیجیے گا کا استعمال طلبا میں بہت مقبول ہے۔ اسکول اور کالج جاتی ہوئی لڑکیوں سے طلبا اکثر ٹکرا جاتے ہیں۔ اس ٹکراؤ کا ایسا ویسا نتیجہ بھی نکل سکتا تھا لیکن "ٹکراؤ کے فوراً بعد معاف کیجیے گا" اس تیزی سے زبان پر آجاتا ہے کہ حاصل نتیجہ صفر ہو کر رہ جاتا ہے، اور ویسے لڑکیاں بھی ایسے اتفاقیہ ٹکراؤ کا بہت کم اثر لیتی ہیں۔

بس کھلنے میں دیر تھی۔ میں بس میں داخل ہوا تو ساری سیٹیں بھر چکی تھیں۔ ایک سیٹ خالی تھی جس پر رومال رکھا تھا۔ اس رومال کو جیب میں ڈال کر میں اسی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک شخص میرے پاس آکر بولے۔ معاف کیجیے گا یہ سیٹ میری ہے۔ میں نے اس پر رومال رکھ چھوڑا تھا۔ میں فوراً اپنی جیب سے رومال نکال کر ان کے حوالہ کر دیتا ہوں۔ معاف کیجیے گا۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ میرا رومال ہے لیکن میں اسی سیٹ پر ڈٹا رہتا ہوں۔

عید کی نماز کے بعد دو صاحبان چادر کا کونہ پکڑے چندہ وصول کر رہے ہیں ایک صاحب چادر میں پانچ کا نوٹ ڈال کر دس کا نوٹ اٹھا لیتے ہیں۔ جب چندہ وصول کرنے والے ٹوکتے ہیں تو وہ شرما کر کہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ دراصل مجھے دو کا نوٹ اٹھانا تھا۔ بات یہ

ہے کہ میرے چشمہ کا پاور ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔

ایک صاحب ہیں جو ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ ہر روز صبح سویرے سویرے غریب خانہ پر تشریف لے آتے ہیں۔ اور گھنٹوں سر مغزنی کے بعد جانے لگتے ہیں تو یہ ضرور ارشاد فرماتے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔

ٹرین میں وقت کاٹنے کے لئے اخبار خرید نا در اصل دوسروں کے لئے خرید نا ہے۔ ادھر اخبار خریدا نہیں کہ بغل والے مسافر کہیں گے۔ معاف کیجئے گا ذرا ایک منٹ اخبار دیکھ سکتا ہوں ظاہر ہے کہ اخلاقاً آپ دے ہی دیں گے پھر وہ کبھی واپس نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ ایک مسافر سے دوسرے مسافر بھی ایک ہی منٹ کے لئے مانگیں گے۔ یہاں تک کہ اخبار ایسا لاپتہ ہو گا جیسے آپ نے خریدا ہی نہ تھا۔

معاف کیجئے گا کا سہارا اخبار کے ایڈیٹروں کو اکثر لینا پڑتا ہے۔ وہ بھی کاتب صاحبان کے سلپ آف پن کی وجہ سے پتہ نہیں کتابت کرتے وقت کاتب صاحبان عالم تخیل میں کہاں پہنچ جاتے ہیں کہ ہاشم عظیم آبادی کو ابلیس عظیم آبادی لکھ جاتے ہیں۔ اب ایڈیٹر صاحب معاف کیجئے گا کہہ کر معذرت نہ چاہیں تو اور کیا کریں۔

ایک شاہ صاحب کے دست سوال پھیلانے پر میں نے دس پیسے کا ایک سکہ ان ہتھیلی پر رکھ دیا۔ تو وہ حضرت پیسے لوٹا کر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے بولے۔ آپ مجھے بھکاری سمجھ رہے ہیں۔ شاید معاف کیجئے گا۔ میں بھکاری نہیں خاندانی فقیر ہوں۔ ایک روپیہ سے کم قبول نہیں کرتا۔

میں سنیما ہال میں داخل ہوتا ہوں پکچر شروع ہو چکی ہے۔ اور ہال بالکل تاریک ہے میں اپنی سیٹ تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں کسی کے پیر پر پیر اسکا ری پھر کم پیر پڑ جاتا ہے۔ اور میں معاف کیجئے گا کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں پھر تاریکی میں خالی سیٹ سمجھ کر کسی خاتون کی گود میں بیٹھنے لگتا ہوں۔ وہ مجھے بڑے دھکیلتے ہوئے کہتی ہیں۔ اے صاحب یہ آپ میری گود میں کیا دھنستے چلے آ رہے ہیں۔ خالی سیٹ تو بغل میں ہے۔ اور میں معاف

کیجیے گا کہتا ہوا اس خالی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن فلم ختم ہونے کے دس منٹ پہلے ہی ہال سے باہر نکل آتا ہوں۔ اس ڈر سے کہ اس خاتون کا شوہر کہیں آس پاس ہی نہ بیٹھا ہو۔

میں ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا۔ کہ ایک کوٹھے سے پانی کی کچھ بوندیں مجھ پہ پڑیں۔ میں نے گردن اٹھا کر بہ آواز بلند پوچھا ـــــ ارے صاحب یہ کیسا پانی ہے جس کی بوندیں ابھی مجھ پر پڑی ہیں۔ میری آواز سن کر ایک بوڑھے میاں کوٹھے سے نیچے جھانک کر بولے ... معاف کیجیے گا۔ یہ کوئی ایسا ویسا پانی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی منّے نے پیشاب کیا ہے جس کی چھینٹیں آپ پر پڑی ہیں۔ پھر بھی معاف کیجیے گا۔



کتوں کی کانفرنس

ایک وسیع میدان میں سینکڑوں کتوں کو اکٹھا دیکھ کر میں نے سوچا یہ اجتماع یقیناً کوئی مقصد ضرور رکھتا ہے۔ کیا عجب کہ انھوں نے اپنی کانفرنس بلائی ہو۔ لیکن کتوں کی زبان کون سمجھ سکتا ہے بھلا۔ تب ہی میں نے دعا کی۔ بار الہا۔ تھوڑی دیر کے لئے کتوں کی زبان سمجھنے کی مجھے صلاحیت عطا کر دے۔ شاید وہ گھڑی قبول دعا کی تھی۔ میں کتوں کی بولی سمجھنے لگا۔

ایک دم کٹا کتا ایک ٹیلے پر چڑھا اور ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر کے بولا۔۔ قبل اس کے کہ کانفرنس کی کاروائی شروع ہو میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو ڈیلیگیٹ کتے پیشاب کی حاجت محسوس کر رہے ہوں یا بغرض تفریح بھونکنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ ان مشاغل سے جلد از جلد فارغ ہولیں۔۔۔۔ (دس منٹ کے وقفہ کے بعد)۔۔۔۔ اب کانفرنس کی کاروائی شروع ہو رہی ہے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے اعلان کے باوجود بہت سے ڈیلیگیٹ ہڈیاں چباتے نظر آرہے ہیں۔ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ لیڈیز کتیاں جو اپنے پلوں کو ساتھ لائی ہیں وہ اس قدر شور مچا رہے ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لہذا ان لیڈیز سے میری پر زور گذارش ہے کہ وہ اپنے اپنے پلوں کو سنبھالیں۔۔۔۔۔ ساتھ ہی نہایت ادب کے ساتھ اپنے بزرگ اور قابل صد احترام اسٹریٹ ڈوگ سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لا کر اپنے خیالات سے ہمیں نوازیں۔

دُم کٹے کا اسٹریٹ ڈاگ کہنا تھا کہ سینکڑوں کتے بھونکنے لگے۔ اور پھر ایک ادھیڑ عمر کا کتا ان سبھوں کی نمائندگی کرتا ہوا بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کتنی مشکلوں سے ہم نے انگریزوں کو دیش سے نکالا دیا ہے۔ اس پر بھی ان کی زبان کا استعمال کیوں۔ یہ کہہ کر وہ کتا اپنے ہمنواؤں کے

ساتھ واک آوٹ کر لیا۔ بعد میں دم کٹے کے اظہار معذرت پر سب ہی ناراض گروپ کے
کتے واپس آ گئے۔ تو وہ اسٹریٹ ڈوگ اٹھا اور آدھی چچوری ہوئی ہڈی اپنی گھر والی کے سپرد کر کے
زور زور سے بھونک کر بولا۔ میرے عزیز دم کٹے نے جس نام سے مجھے مخاطب کیا ہے اس پر
مجھے فخر ہے کیونکہ آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ ہم دلدادگان آزادی گلیوں۔ بازاروں اور
سڑکوں پر آزادانہ گھوم پھر کر جو راحت محسوس کرتے ہیں ویسی راحت اور مسرت میرے ان ساتھیوں
کو میسر نہیں جو کوٹھیوں۔ بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ان کے سارے
حرکات و سکنات دوسروں کے اشاروں کے رہین منت ہوں۔ اس طرح پابہ زنجیر رہنے والے کتے
مرغن غذا کھا کھا کر اس قدر کوڑھ مغز ہو جاتے ہیں کہ ہم آزادوں کی طرح فی البدیہہ اشعار نہیں
کہہ سکتے...... سب ہی حضرات واقف ہیں کہ جب رات کے سناٹے میں ہماری طبیعت موزوں
ہوتی ہے تو ہم حلوائی کی دکان کے چولہے سے نکل کر بہ آواز بلند ایک مصرعہ طرح دے دیتے ہیں
تو جواباً ہر چہار جانب سے اشعار کی بارش ہونے لگتی ہے اور اس قدر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے
کہ انسانوں کی مداخلت کے بعد ہی محفل مشاعرہ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یہ ہم ہی گلیوں اور سڑکوں پر رہنے
والے کتے ہیں جو بیچ سڑک پر آنکھیں بند کئے فلسفہ کی مشکل سے مشکل گتھی سلجھاتے رہتے
ہیں اور یہ ہم ہی ہیں جن سے سڑکوں۔ بازاروں اور گلیوں کی رونق ہے۔ ہیں یہ اوصاف نازو
نعمت میں پلنے والے کتوں میں۔ مگر انسان! خدا بچائے اس دو ٹانگوں والے جانور سے
انسانیت تو بہت دور کی بات ہے۔ ان میں ہم کتوں کی طرح کتا پن کا بھی فقدان ہے۔ وہ ہماری
طرح صبر و شکر۔ قناعت اور خوئے وفاداری سے یکسر محروم ہیں۔ وہ ہم کتوں کو بلا وجہ اذیت
دیتے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت وہ ہمیں ڈھیلوں سے نواز دیں گے۔ مگر یہ ہمارا کتا پن
ہے کہ ہم ان پر جوابی حملہ نہیں کرتے۔ اگر کبھی بہ حالت مجبوری انہیں کاٹ لیتے تو وہ چودہ سوئیاں
لگا کر چاق و چوبند ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہی انسان اگر ہمیں کاٹ کھائے تو ہماری جان کے لالے
پڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے کاٹ کا کوئی جواب نہیں۔ اس پر بھی ہماری نادان قوم ہے کہ انسان
ہی کے ساتھ رہ کر زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی ہے (زور زور سے بھونک کر)..... تو

یہ کانفرنس اسی غرض وغایت کے تحت بلائی گئی ہے کہ ہمارے دانشور یکجا ہو کر غور کریں کہ قوم کی ناگفتہ بہ حالت ان کی بے چارگی اور بے بسی کے مداوا کی کیا صورت اختیار کی جائے ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ تو اس موضوع پر میرے دوست موٹو اظہار خیال فرمائیں گے۔ اس وقت میرے خیالات کی روانی میں اس ہڈی کی یاد رکاوٹ ڈال رہی ہے جسے اپنی گھروالی کے پیر دکر آیا تھا۔

دُم کٹے کے آواز دینے پر ایک فربہ کتا اکڑتا ہوا ٹیلے پر چڑھنے لگا تو اپنی فربہی کے باعث لڑھک گیا۔ وہ بارہ چڑھنے کی کوشش کے قبل اس نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کیا۔ اور پھر بھونک کر چند اشعار سنانے کے بعد یوں گویا ہوا۔

اگر آپ صاحبان اسے خود ستائی نہ سمجھیں تو میں اپنی عالی نسبی کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ کردوں جسے سن کر اظہار مسرت میں آپ سب ہی حضرات آسمان سر پہ اٹھالیں گے ۔۔۔۔۔۔ جی ہاں ۔۔ یہ ناچیز آنجہانی لائیکا کا جھکڑ پوتا ہے۔ جسے خلا میں جانے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ محترمہ لائیکا کے اس عظیم کارنامہ نے ہماری قوم کو وہ اعزاز بخشا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اب رہی یہ بات کہ اس کانفرنس کی غرض وغایت کے تحت ہم اپنی قوم کے فلاح وبہبود کے لئے کیا کیا کر سکتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں مختصر الفاظ میں اپنے تجربات اور دانشوروں کے خیالات کو نچوڑ کر بہ بانگ دہل یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری قوم کا ایسا سوچنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ شروع ہی سے ہماری وابستگی انسان کے ساتھ رہی ہے۔ ہم انسان کے دست نگر ہیں۔ اور دست نگر رہیں گے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ اور فلاح وبہبود کی جو بات سوچتے ہیں تو اس کا انحصار بھی حضرت انسان سے وابستہ رہنے ہی پر ہے ۔۔۔۔ ۔۔۔ بھائیو یہ مقام حیرت ہے کہ ہم نے کبھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے مفاد کی خاطر کوئی مناسب راہ اختیار کی۔ لہٰذا صورت حال یہ ہے کہ عالم وجود میں آتے ہی ہماری نظریں فصائی کے پھینکے ہوئے چھیچھڑوں پہ رہتی ہے یا کوڑے کرکٹ پر پڑی ہوئی چیزوں پہ ۔۔۔۔۔۔ ہم ایسے احمق ہیں کہ اگر انسان ہمیں ایک روٹی کھلا دیتا ہے تو ہم اس کے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ اور اگر کسی نے ایک ڈھیلا

رسید کر دیا تو ہم بھاگ کھڑے ہوتے ہیں تیں تیں کرتے ہوئے۔ توبہ توبہ۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہم کتے طاقت پرواز نہیں رکھتے۔ مگر معنی کے لحاظ سے یہ شعر ہم سبھی کتوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری قوم اگر انسان کا ساتھ نہ دے۔ ان کا منھ نہ تکے۔ اور ان کے آگے دم نہ ہلائے تو کھائے کہاں سے انسان سے وابستگی ہی تو ہمارا ذریعہ معاش ہے۔ ہم اپنی فلاح وبہبود یا الگ کوئی بنانے کی بات تب ہی سوچ سکتے ہیں جب کوئی ایسا انقلاب آئے کہ ہم کتے بھی حضرت انسان کی طرح کھیتی باڑی کر کے فکر معاش سے خود کفیل ہو جائیں۔

اب ایک مریل کتے نے ڈائس پر قدم رکھا۔ جو کچھ دیر پہلے نالی میں بیٹھا دنیا اور اس کی بے ثباتی پر غور کر رہا تھا۔ ڈائس پر آکر اس نے بدن جھاڑا تو اس کی بوندیں پڑیں سامنے بیٹھے ہوئے ڈیلیگنٹس پر۔ مگر ان کی غراہٹ نظر انداز کر کے اس مریل کتے نے اپنی تقریر شروع کی۔

بھائیو اس کانفرنس کا اصل موضوع ہے اپنے فلاح وبہبود کی مناسب راہیں نکالنی...... تو اس سلسلہ میں یہ واضح کر دوں کہ میری ساری زندگی اسی دشت کی پیمائی میں گزری ہے تب ہی تو آپ صاحبان دیکھ رہے ہیں کہ غور وفکر کرتے کرتے اس حالت کو پہنچا ہوں کہ میرے جسم میں صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن مسلسل غور وفکر کے بعد بھی انسان کے چنگل سے چھٹکارا پانے، خود کفیل ہونے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کی کوئی سبیل نہ نکال سکا ہوں۔ میں نے اپنی قوم کے دانشوروں، بزرگوں اور سائنس دانوں سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن وہ سب کے سب دم دبا کر بھاگ گئے۔ پھر بھی میں نے اپنی انتھک کوشش اور غور وخوض کے بعد ایک مناسب راہ نکال ہی لی ہے۔ اور وہ ہے

فیملی پلاننگ یعنی ہم دو اور ہمارے دو۔ لیکن تھوڑی اڑچن یہ سامنے آتی ہے کہ ہمارے
لیڈیز ایک جھول میں چھ بچے تک تولد فرماتی ہیں۔ پھر بھی اگر فیملی پلاننگ کو ہم سارے کتے
اپنا لیں تو فلاح و بہبود کے بہت سارے راستے خود نکل سکتے ہیں۔ اس طریقۂ روک تھام
سے اگر ہماری قوم کے افراد فائدہ نہ اٹھائیں تو اس سے بڑھ کر ہماری حماقت اور کیا
ہو سکتی ہے فلاح و بہبود خود ہمارے قدموں پر نچھاور ہوں گے۔ مگر۔

پہلے پیدا تو کرے ایسا کوئی ذوقِ سلیم

یکایک فیملی پلاننگ کی مخالفت اور موافقت میں دو جماعت ہو گئی۔ اور
دونوں گروہ میں اس قدر دھینگا مشتی اور ہنگامہ آرائی ہوئی کہ چند آوارہ لڑکے یہ
شور و غل سن کر آ پہنچے اور انھوں نے جم کر اس قدر ڈھیلا بازی کی سارے کتے بھاگتے
نظر آئے اور اس طرح کتوں کی کانفرنس افراتفری کی حالت میں اختتام پذیر ہوئی۔



مرض شاعری کے تین اسٹیج

شاعر اگر پیدائشی ہوتا ہو تو یہ اور بات ہے ورنہ بہ ظاہر شاعری چھوت کا مرض ہے۔ جو کسی شاعر کے کونٹیکٹ میں آجانے سے ایک تندرست اور توانا آدمی شاعری کے جراثیم سے متاثر ہو کر اشعار کہنے لگتا ہے۔ پہلے اسٹیج میں نہ تو اشتہا میں کمی آتی ہے اور نہ کسی طرح کی نقاہت ہی محسوس ہوتی ہے۔ بس ہوتا یہ ہے کہ موزوں اور غیر موزوں اشعار کا نزول ہونے لگتا ہے۔ اسی اسٹیج میں تخلص کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر شعرا برادری نے کوئی تخلص چھوڑا ہو تب تو نیا تخلص پلے پڑے یہاں تو یاروں نے پھیپھڑا، کلیجی اور جگر تک کو نہ بخشا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ انتڑی اور مثانہ شعراء کی پہنچ سے محفوظ ہے۔ مجبوراً گھسا پٹا تخلص رکھ کر مریض اپنے شاعر ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا سوال درپیش ہوتا ہے، شاعر اپنی غزل خوشخط لکھ کر کسی استاد شاعر کی خدمت میں حاضر ہو کر مؤدب بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت استاد نووارد کی صورت، فرشی سلام اور انداز نشست سے سمجھ جاتے ہیں کہ صاحبزادے ان کی خانقاہ فیض رساں سے اپنی خالی جھولی بھرنے آئے ہیں۔

مرض کے دوسرے اسٹیج میں مریض کو چھپنے چھپانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ اس ذوق کی تکمیل کے لئے اخباروں اور رسائل میں تازہ اور باسی کلام بھیج کر مدیران کرام کی نظر عنایت کا منتظر رہنا پڑتا ہے۔ اگر کبھی کوئی تخلیق کسی رسالہ میں شائع ہو گئی تو آنجناب پر شاعری کا ایسا نشہ چڑھتا ہے کہ حصول معاش کے ذرائع سے بے نیاز ہو کر زلف لیلائے سخن کے سلجھانے میں شب و روز لگے رہتے ہیں۔

شاعر بحرِ تخیل میں خیالات کی نسی ڈالے اشعار کی مچھلیاں پھنساتے میں مشغول ہے دروازے پر دستک کی آواز سن کر باہر نکلتا ہے۔ ایک صاحب پُر خلوص انداز میں مصافحہ کرکے فرماتے ہیں۔ قصہ یہ ہے مہربان کہ میری اہلیہ کو پہلا بچہ تولد ہوا ہے۔ اس خوشی میں ارادہ تھا کہ اظہارِ مسرت کے لئے بھانڈوں کو بلوا لوں۔ لیکن اہلیہ کہتی ہیں کہ بھانڈوں سے کہیں زیادہ رونق محفلِ مشاعرہ برپا کرنے سے ہوگی ..... تو وہی اہلیہ کی رائے سے متفق ہو کر آپ کو مدعو کرنے آیا ہوں۔ قیام اور طعام کا بھی معقول انتظام ہے۔ بچے کی ولادت سے متعلق اشعار کہہ کر لانا نہ بھولئے گا۔

شاعر کے دل کی کلی اس وقت کھل جاتی ہے جب کہیں برپا ہونے والے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملتا ہے۔ اگر طرحی مشاعرہ ہے تو مصرعہ طرح پر اچھے سے اچھا شعر نکالنے کی دھن میں حضرت شاعر کئی کئی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ اور جب مرکب کر تازہ غزل کے ساتھ مشاعرہ لوٹ لینے کی خیالی دنیا عالم تصور میں بسائے مائک پر غزل سرا ہوتے ہیں تو اپنے کو اس بلندی پر پہنچا ہوا محسوس کرتے ہیں جہاں تصور کی رسائی ممکن نہیں۔ لیکن جب سامعین کی طرف سے تالیاں بجتے، جوتے رگڑتے، کھانسی کا دورہ پڑتے۔ سیٹیاں بجنے چیخنے، چلاتے اور ماتم کرنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں تو یہ حضرت کوئی راہ فرار نہ دیکھ کر صاحب صدر کے پیچھے گال پھلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

مرض شاعری کے اسی تیسرے اسٹیج میں اپنا کلام کتابی شکل میں پیش کرنے کا جنون سوار ہوتا ہے۔ اس کے لئے دن رات ایک کر کے مجموعہ کلام کسی اردو اکیڈمی میں داخل کرکے اللہ سے لو لگاتے ہیں۔ اگر حیات کی ڈوری مضبوط رہی اور تقدیر نے ساتھ دیا تو کبھی نہ کبھی کتاب کی طباعت کے لئے مالی تعاون حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

مرض کے تیسرے اسٹیج میں شاعر کو اشعار سنانے کا دورہ پڑنے لگتا ہے جب تک کسی کو پکڑ پکڑ کر اپنا کلام کلام نہ سنائے اس کو چین نہیں ملتا۔ ایک ایسے ہی مریض کے لپیٹے میں بذات خود آچکا ہوں۔ جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ دادی اماں کے انتقال

کی خبر اپنے ایک بزرگ شاعر کو دینے گیا۔ وہ اپنے تازہ کلام پر نظر ثانی کر رہے تھے انتقال کی خبر سن کر آبدیدہ ہو کر حیات و موت سے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر کر کے بولے ــــ عزیزم جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ یہ ایک تازہ ترین غزل ہے اسے سن ہی لو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی جنازہ میں شرکت کے لئے چلتا ہوں ...... یہ کہہ کر وہ غزل سرا ہوئے ان کا پاس ادب تھا کہ میں کوئی عذر پیش نہ کر سکا۔ اور غزل سرائی میں گھنٹوں لگ گئے۔ وہ ایک غزل کے بعد دوسری غزل ترنم سے شروع کر دیتے۔ جب میں نے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تو اپنی بیاض بزرگ نے [illegible] ـــ تو لو ابھی آیا کہتے ہوئے حویلی کے اندر چلے گئے۔ حویلی سے کافی دیر بعد باہر نکل کر معذرت کرتے ہوئے بولے۔ بات یہ ہے عزیزم کہ میں غسل کرنے لگ گیا تھا۔ اس سے فراغت کے بعد استنجا کر کے بیٹھا تو وہیں بیت الخلا میں مرحومہ کے انتقال پر ملال پر چند اشعار ہو گئے۔ انہیں بھی لگے ہاتھوں سن ہی لو ـــــ قہر درویش بہ جان درویش جب ان سے کسی طرح پیچھا چھڑا کر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جنازہ کب کا گورستان جا چکا ہے۔ دوڑتا ہوا قبرستان پہنچا۔ جب تک دادی مرحومہ سپرد خاک ہو چکی تھیں۔ مرض شاعری کے تیسرے اسٹیج کے مریض کے پھیر میں دادی مرحومہ کے آخری دیدار سے محروم رہ گیا۔ تب ہی سے میں نفسیاتی طور پر شعراء سے کتراتا ہوں اس خیال سے کہ جانے یہ حضرت مرض شاعری کے کس اسٹیج سے گزر رہے ہیں۔



نانی عشو

نانی عشو نے اپنے دورِ حیات میں نہ جانے کتنے انقلابات دیکھے ہوں گے۔ بدلتے ہوئے فیشن۔ نئے طرز کے پہناوے۔ اور طرح طرح کے زیبائش کے طریقے لیکن وہ پرانی وضع کی پابند رہ کر لکیر کی فقیر بنی رہیں۔ نانی عشو کے بیٹے اگر زمانہ کی بدلتی ہوئی روش کے مطابق پر پُرزہ نکالتے یا بیٹوں میں سے کسی کو بھی مائل بہ پرواز دیکھتیں تو نانی عشو انھیں خوب جھکا دیتیں یہاں تک کہ نانی پہ تو اگر باہر کی مسموم ہوا کا ذرا بھی شک ہوتا تو ان کو کبھی نہ بخشتیں۔ اور اس روز تو نانی عشو کے مزاج کا پارہ انتہائی ڈگری کو بھی پار کر گیا جب بڑی بہو بال ترشوا کر اور بھویں بنوا کر سیلون سے لوٹیں۔ نانی نے حسبِ عادت خوب اکھاڑ پچھاڑ مچائی۔ بیگم بہو رانی نے بھی وہ طراق پڑاق سنائی کہ نانی کی بولتی ماری گئی۔ لیکن بعد میں نانی نے اپنا سارا غصہ بے چارے نانا پر اتارا۔

اب نانی عشو بہو کی صورت سے بیزار رہنے لگیں۔ لیکن چالاک بہو نے ساس کا بدلا ہوا تیور دیکھ کر ان کو ایسا مٹھی میں کیا کہ نانی سارے گلے شکوے بھول کر بہو کے فیشن والے چوچلوں میں دلچسپی لینے لگیں۔ اب [illegible] کے بدلے ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے لگیں۔ اُبٹنہ چھوڑ کر صابن سے منہ دھوتیں۔ اور [illegible] پاؤڈر چھڑک کر اس قدر مسرت اور فرحت محسوس کرتیں کہ نانا کو بھی فیشن کی یہ چیزیں استعمال کرنے کی سخت تاکید کرتیں۔

کچھ دنوں بعد جب منجھلی بہو آئیں تو وہ بھی فیشن پرستی میں بڑی بہو سے چار ہاتھ آگے تھیں لیکن بڑی بہو کے زیرِ اثر نانی اس قدر بدل چکی تھیں کہ منجھلی بہو کے ناپسندیدہ حرکات دیکھ کر بھی اعتراض نہ کرتیں۔

ایک دن کھیل ہی کھیل میں بڑی بہو اپنے شوہر سے بولیں۔ آج اماں کو بھی اسکوٹر پر بیٹھا کر ذرا گھما تو دیں۔ یہ سن کر نانی عشو اپنے سر پر دو ہتھڑ مار کر بولیں۔ توبہ کرو بہو۔ ایسا کیا بھی کیا کہ اس عمر میں اسکوٹر پر چڑھوں گی۔ لیکن دونوں بہوؤں نے مل کر نانی کو ایسا گھیرا کہ مجبوراً انھیں بہوؤں کی بات ماننی ہی پڑی۔ پہلے تو نانی ڈریں لیکن جب ہچکچاہٹ جاتی رہی اور حوصلہ بڑھا تو اسکوٹر سے اترنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ یہاں تک کہ پٹرول ختم ہو کر اسکوٹر خود ہی رک جاتا۔

نانی عشو کے بار بار کہنے پر نانا بھی یہ مشکل اسکوٹر پر چڑھنے کو تیار ہوئے ان کے صاحبزادے نانا کو اسکوٹر کے پیچھے بیٹھا کر تیزی سے سڑک پر نکل گئے تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ لوٹے تو نانی نے سر پیٹ لیا۔ کیونکہ نانا اسکوٹر کے پیچھے نہ تھے۔ ہم لوگ دوڑے نانا کی تلاش میں۔ دیکھا کہ نانا میاں لنگڑاتے چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی نانی سے کھسا کر بولے۔ یہ تمہارے ہی بہکاوے میں آکر میں اپنی مٹی پلید کر بیٹھا۔ راستے میں مجھے نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ اسکوٹر سے لڑھک کر چاروں شانے چت بیچ سڑک پر گرا۔ جب ضد کر کے اسکوٹر پر چڑھایا ہے تو اب جلدی چونا بھی چڑھاؤ۔

تیسری بہو اپنے ساتھ رنگین ٹی۔ وی لائیں۔ پہلے روز ٹی۔ وی پر چترہار دیکھ کر نانی عشو نے اپنے منھ پر آنچل ڈال لیا۔ اور نانا کو پاس ہی کھڑا دیکھ کر انھوں نے پھٹکارا۔ ذرا شرم بھی نہیں آتی آپ کو۔ جو دیدہ پھاڑے پرائی عورت ناچتے تھرکتے دیکھ رہے ہیں۔ نانا بے چارے ایک سعادت مند شوہر کی طرح منھ لٹکائے بیٹھک میں چلے آئے۔ لیکن چند ہی روز بعد نانی کی دلچسپی ٹی۔ وی کے پروگراموں سے اس قدر بڑھی کہ چترہار کا پروگرام شروع ہوتے ہی نانا کو بھی زبردستی گھسیٹ لائیں۔ لیکن نانا چترہار دیکھنے کے دوران توبہ استغفار کرتے رہتے۔

ٹی وی پر طرح طرح کے اشتہار کی تصاویر دیکھتے دیکھتے نانی کو بھی اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرنے کی دھن سوار ہوئی۔ نانی نے نانا سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو نانا عالم حیرت میں

زمین سے تقریباً دو فٹ ہوا میں معلق ہو کر بولے - استغفر اللہ! دماغ تو نہیں کھسک گیا ہے تمہارا - جو نانی پوتے والی ہو کر جوان بننے چلی ہو - میں پوچھتا ہوں - آخر تمہارے سفید بالوں میں کون ایسے کیڑے پڑے ہیں جو انھیں سیاہ کرنے کے چکر میں ہو - لیکن نانی پر کچھ ایسی دھن سوار تھی کہ نصیبن بوا کو بازار بھیج کر خضاب کی شیشی منگوائی اور اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرکے نانی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو انھیں اپنی جوانی لوٹتی نظر آئی - انتہائی مسرت کے عالم میں دوڑیں نانا کی بیٹھک کی طرف - اُن سے اپنے کارنامہ کی داد لینے - لیکن نانا نے لاحول پڑھ کر جو اپنا منھ پھیرا تو اس وقت تک منھ پھیرے ہی رہے جب تک کہ نانی تھوتھنا لٹکائے واپس نہ ہو گئیں - نانا کی اس بے رخی سے نانی کا دل جل گیا - اب وہ نانا سے منھ پھلائے رہتیں - ان کا ناشتہ اور کھانا نصیبن بوا سے باہر بھجوا دیتیں - جب ہفتوں رسہ کشی میں گزر گئے تو نانی اس شرط پر نانا سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہوئیں کہ وہ ایک گھنٹہ کے اندر اپنے سر اور داڑھی کے بال سیاہ کرکے دکھلائیں مجبوراً نانا اٹھے اور پہنچے بنیا کے یہاں بنیا نے بال سیاہ کرنے کی نہ جانے کون سی شیشی حوالہ کر دی کہ جسے لگاتے ہی نانا کے چاروں ابروؤں کا صفایا ہو گیا - نانا کی یہ درگت دیکھ بہوؤں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا - اور نانا ہیں کہ منھ چھپائے پھر رہے ہیں -

اس کے دو سال بعد چوتھی بہو بمبئی کار سے اتریں تو میکسی پہنے ہوئے - نانی نے کبھی میکسی نہ دیکھی تھی - یہ اُن کے لئے ایک نئی چیز تھی - سمجھیں تو اسی قدر کہ بہو نئے فیشن کا لہنگا پہن کر آئی ہے لیکن بہت غور و خوض کے بعد نانی نے یہ فیصلہ کیا کہ میکسی لہنگا سے الگ کوئی فیشن کی چیز ہے -

ایک دن ان چاروں بہوؤں نے یہ پروگرام بنایا کہ آج کسی طرح نانی کو میکسی پہنائی جائے - اس پروگرام کے مطابق بہوؤں نے نانی کو گھیرا نانی بھلا میکسی کہاں پہنتیں بہت اصرار کرنے پر بہوؤں کا دل رکھنے کو نانی نے میکسی لے لی اور اس کو نانا کے کمرے میں کھونٹی پر ٹانگ دی لیکن صبح سویرے جب نانی میکسی تلاش کرتی ہیں تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا - نانی نے کونا کونا چھان مارا - وہ حیران تھیں کہ نانا کے کمرے سے میکسی آخر کون لے

اڑا۔ نانی اسی شش و پنج میں تھیں کہ نانا میکسی پہنے لپکتے ہوئے آتے دکھائی دیئے قریب آتے ہی منھ بسور کر بولے ۔ اجی کیا بتاؤں ۔ صبح کی نماز کے لئے جلدی میں مسجد جاتے وقت کھونٹی پر ٹنگی ہوئی میکسی کو اپنا انگا سمجھ کر پہنتے ہوئے مسجد چلا گیا۔ دوسری رکعت میں جب اس بھول کا احساس ہوا تو نیت توڑ کر چلا آرہا ہوں ۔ وہ تو خیر بیتا ہے کہ ابھی پھر میں اجالا نہیں ہوا ہے اس لئے امید ہے کہ کسی نے مجھے میکسی پہنے ہوئے نہ دیکھا ہوگا ۔

نانی عنو مسکراتے ہوئے بولیں ۔ اگر آپ کو میکسی پہنے ہوئے کسی نے دیکھ بھی لیا ہو تو اس نے آپ کو مرد تھوڑا ہی سمجھا ہوگا ۔ جب کہ خیر سے آپ کے چاروں انڈوں کا پہلے ہی صفایا ہو چکا ہے ۔ اور جب دھوکے میں آپ نے میکسی پہن ہی لی ہے تو تھوڑی دیر اور پہنے رہیں ۔ تاکہ آپ کی چاروں بہو بیٹیں بھی دیکھ لیں کہ میکسی پہن کر مرد کی صورت کیسی لگتی ہے وہ بھی بڑھاپے میں ۔۔



مُردوں کی کانفرنس

رات کا سناٹا دو بجے شب کا وقت - اور قبرستان میں اس قدر ہجوم۔ مگر یہ کیا یہ تو سب ہی کفن پوش ہیں...... اور وہ سامنے جلی حرفوں میں کیا لکھا ہے.... ذرا دیکھوں تو سہی...... ایں مُردوں کی کانفرنس۔! تو کیا اب یہ مُردے بھی اپنی کانفرنس بلانے لگے۔ تو کیوں نہ اس درخت کی آڑ میں ہو کر کانفرنس کی کاروائی دیکھی جائے۔

جب بہت سارے مردے قبروں سے نکل کر گورستان میں اکٹھا ہو گئے تو ایک مردے میاں ایک پختہ قبر پر چڑھ کر بولے۔ اس قبرستان کے سب سے بزرگ مردہ جناب شین مرحوم کا اسم گرامی مردوں کی کانفرنس کی صدارت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اس تجویز کی تائید سب ہی مردوں نے کی۔

جناب صدر یعنی شین مرحوم کفن پر پڑے گرد و غبار جھاڑ کر بولے اس عزت افزائی کے شکریہ کے بعد جناب غین مرحوم سے گذارش کر رہا ہوں کہ وہ تشریف لائیں۔

جناب غین مرحوم یوں گویا ہوئے ـــ بھائیو - میرا دم توڑنا تھا کہ میری اولاد نے کفن دفن میں اس قدر عجلت کی کہ جیسے وہ سب ہی میرے مرنے کے منتظر ہوں.... ... اور یہ کفن جو مجھے دیا گیا ہے اسے آپ حضرات دیکھ ہی رہے ہیں کہ کس قدر گھٹیا ہے - اگر ایسا ہی معمولی کفن دینا تھا تو کھدر کا کفن دیئے ہوتے جو ایک حد تک بیش پوشی بھی ہے۔ اسی کھدر کے طفیل میں ایک مردے سے قبر میں سوال تک نہ کیا گیا۔ کیونکہ ـــ

بولے فرشتے اس کے گنہ سب معاف ہیں
کھدر کا پورا کھتا ان پٹنے کفن میں ہے

گرتے گرتے سنبھل کر معاف کیجئے گا۔ قبر سے ایک مدت بعد نکلنے اور کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی وجہ سے سر چکرانے لگا ہے۔ لہٰذا مجبوراً اجازت چاہوں گا ـــــ

جناب صدر نے قاف مرحوم کی طرف اشارہ کیا۔

جناب قاف مردہ چالوں سے چلتے ہوئے پختہ قبر پر چڑھے۔ اور نہایت نحیف آواز میں بولے ـــ ابھی ابھی جناب غین مرحوم نے اپنی مختصر تقریر میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ویسے حالات سے قریب قریب بھی مُردے دوچار ہوتے ہیں۔ ادھر ہم نے داعی اجل کو لبیک کہا ہیں کہ اعزا اور احباب کاندھوں پر چڑھا کر گورستان لے جاتے ہیں۔ ان کے سارے خلوص اور محبت کے اظہار تجہیز و تکفین تک محدود رہتے ہیں۔ چہارم کے بعد ہی سے لوگ بھولنے لگتے ہیں...... اعزا شب برات میں اپنے لئے جو حلوا بنواتے ہیں وہ اصلی گھی میں۔ اور ہم مُردوں کے فاتحہ والے حلوا میں ڈالڈا ملا دیتے ہیں۔ گویا مرتے ہی ہم مردے ایسے گئے گزرے ہو جاتے ہیں کہ اصلی گھی سے بنے ہوئے حلوہ سے فاتحہ کے بھی مستحق نہیں رہتے۔ اور ستم یہ کہ میرے اعزا نے آج تک ایک کھوٹی کوڑی بھی میرے نام سے خیرات نہ کی حالانکہ اپنے پیچھے اتنی دولت چھوڑ آیا ہوں جو میری اولاد کے سات پشت کام آئے۔ تو بھائی مُردو ان کی اس احسان فراموشی پر دل کڑھتا اور تڑپتا رہتا ہے۔ کمبخت دل اس وقت بھی تڑپ رہا ہے اور صحیح معنوں میں اسے تڑپنا بھی چاہئے۔ کیونکہ ؎

خموشی میں مُصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

اب مرزا جیم مرحوم تشریف لائیں، جناب صدر نے پختہ قبر پر پہلو بدلتے ہوئے آواز دی ـــ

جناب جیم مرحوم نے گلوگیر آواز میں اپنی تقریر کا آغاز کیا ـــ بہ باچیر مُردہ زندوں کے ہاتھوں اس قدر ستایا گیا ہے کہ اس کی یاد ہی سے کلیجہ اب بھی منہ کو آتا ہے .... صاحبو۔ ایک روز اچانک سکتہ طاری ہو جانے کی وجہ سے میری نبض ساقط ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے میری موت

کی تصدیق کر دی ۔ اور کفن دفن کی تیاری ہونے لگی ۔ اب اسے میری بد قسمتی کہئے کہ سکتہ والی کیفیت جاتی رہی ۔ نبض چلنے لگی اور میں اٹھ بیٹھا ۔ دیکھا کہ سرہانے لوبان دانی میں لوبان جل رہا ہے ۔ اور باہر لوگ رو پیٹ رہے ہیں ۔ میں نے لوبان دانی اٹھالی اور جلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ گھر کے اندر بھگدڑ مچ گئی ۔ میری بیوی اور بچے ایک دوسرے سے لپٹ کر چلانے لگے ۔ محلہ کی مسجد کے پیش امام جو میری رحلت کی خبر سن کر تشریف لائے تھے انہوں نے کچھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا ۔ لیکن جب ان کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا تو وہ چیخ مار کر بھاگنے لگے تو میں نے جلتی ہوئی لوبان دانی ان پر پھینک ماری ۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جدھر جاتا لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ۔ یا دروازہ بند کر کے کھڑکی سے جھانکتے ۔ آخر بہ حالت مجبوری ایک ویرانے میں جا کر پناہ لی ۔ اور وہیں بے یار و مددگار زندگی کے دن پورے کرتا رہا ۔ اور یہ کفن جو میرے جسم پر دیکھ رہے ہیں اسے لنل والے مردے سے زبردستی چھینا ہے یہ ہے اس ناچیز مردے کی مختصر داستان حیات ۔

اب جناب طوخاں مرحوم تشریف لائیں ۔ جناب صدر نے پکارا طوخاں مرحوم حاضرین مردوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بولے ۔ مردے بھائیو ! میں اپنے دورِ حیات میں ہمیشہ عوام کے فلاح و بہبود کی باتیں لیڈرانہ انداز میں کرتا رہا انتقال کے بعد بھی وہی انداز فکر رکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ غور فرمائیں مرتے ہی ہم مردوں کی کوئی شخصیت با اہمیت باقی نہیں رہتی ۔ ہماری قبروں میں ایک معمولی دری یا چٹائی تک نہیں بچھائی جاتی ۔ قبریں اس قدر تنگ کہ اٹھ کر بیٹھنا چاہیں تو پٹخن سے سر ٹکرائے ۔ اور یہ مقام حیرت نہیں تو اور کیا ہے کہ ہر طریقہ کار میں نمایاں تبدیلیاں ہوں لیکن تجہیز و تکفین کے طریقہ کار میں کوئی تبدیلی نہ ہو ۔ آخر ایسا کیوں ۔ کیا سائنس کی ایجاد سے ہم مُردوں کو فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں ۔ ہماری قبروں میں بجلی کی روشنی کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا ۔ کیا ہماری دلبستگی کے لئے ریڈیو اور ٹی وی سیٹ مہیا نہیں کئے جا سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی میں تو قبر میں بے کار پڑا ہوا آنسو بہایا کرتا ہوں ۔ اور اب تو شاید اس کی بھی نوبت نہ آئے کیونکہ آنسوؤں کا اسٹاک ختم ہونے کے قریب ہے ۔ لہٰذا میں یہ مشورہ دوں گا کہ آئندہ آنیوالے

مردوں کے لئے ایسی راہ ہموار کی جائے کہ قبروں کو سائنسی آلات سے مزین کرنے کے بعد ہی مردے دفنائیں جائیں ...... اس طرح ہم سارے پرانے مردے بھی اس سے مستفید ہوسکے گیں ...... تو اب ، اوزت چاہوں گا ..... مردوں کی کانفرنس زندہ باد۔

جناب صدر کی زبانی اپنا نام سن کر جناب مرحوم لپکتے ہوئے تشریف لائے وہ کفن پوش ضرور تھے لیکن یہ عالم کہ سر چھپاتے تو پیر کھل جاتا۔ اگر پیر چھپاتے تو سر کھل جاتا۔ بہت دیر تک اس کشمکش میں رہنے کے بعد اپنی کوشش میں ناکام رہ کر انھوں نے لب کشائی کی۔ جناب مرحوم کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم مردوں کی قبریں اس قدر تنگ بنائی جاتی ہیں کہ نہ تو کروٹ بدل سکتے ہیں اور نہ بفراغت پیر پھیلانے کی گنجائش رہتی ہے۔ اور تاریکی اتنی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ایک ایک قبر میں ستر ستر مردے دفن کئے جائیں۔ خود میری قبر میں اب تک پچاس مردے دفن کئے جاچکے ہیں۔ اور مزید نہ معلوم اور کتنے مردے دفن کئے جائیں گے۔ تب ہی تو کہا جاتا ہے کہ ایک ایک قبر سے ستر ستر مردے نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ صور پھونکے جانے پر ہر مردہ چاہے گا کہ وہی سب سے پہلے قبر سے باہر نکلے۔ اس کوشش میں خوب ہی آپس میں دھینگا مشتی ہوگی .... اور ہاں قبر کے اندر کوئی کب تک پڑا رہے اگر کبھی تفریح طبع کے خیال سے قبر سے باہر نکلا بھی تو قبرستان کی زبوں حالی دیکھکر اس قدر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے کہ پھر قبر میں آلیٹتا ہوں ــــــ حضرت صاحب مرحوم ابھی کچھ اور کہنے والے ہی تھے کہ جناب صدر چلائے ــــ بھاگو اور جلدی سے اپنی اپنی قبر میں داخل ہو جاؤ۔ وہ دیکھو سامنے درخت کی آڑ میں کوئی زندہ شخص ہم مردوں کی کانفرنس کی کاروائی دیکھ رہا ہے۔ بھاگو بھاگو ــــ یہ کہتے ہوئے جناب صدر ہی سب سے پہلے اپنی قبر میں جا گھسے ..



یہ رشتے

یہ تو ظاہر ہے کہ سب سے پہلا رشتہ حضرت آدم اور ماما حوّا کے درمیان قائم ہوا اس کے بعد رشتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کا شمار انگلیوں پر ممکن نہیں۔ ان سبھی رشتوں میں ماموں کا رشتہ بڑا مضحکہ خیز ہے۔ کسی راہ چلتے کو ماموں کہہ کر پکار تو لیں وہ راہ گیر مارنے اور مرنے پر تل جائے گا۔ اس کے برعکس چچا کا رشتہ ایسا بے ضرر ہے کہ کسی کو بھی بے کھٹکے چچا کہہ کر ڈھیروں دعائیں لے لیں۔ لطف یہ کہ بعض بھتیجے بھی ایسے ہیں جو ماموں کے رشتے سے کم مضحکہ خیز نہیں۔ مرغی بیچنے والے کو مرغی والا کہہ کر تو پکاریں۔ وہ مرغی والا ایسا غضبناک ہوگا جیسے کسی نے اس کو ماں کو گالی دی ہو۔ ہمارے بزرگ بھی مرغی والے ہی کی طرفداری میں فرمائیں گے۔ میاں مرغی والا نہیں کہتے۔ یہ بہت بری بات ہے۔ جب بھی پکارنا ہو تو مکیے والا کہا کرو۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک شخص جو مرغی بیچتا ہے وہ مرغی والا کہے جانے پر آتش زیر پا کیوں ہوتا ہے...... تو چھوڑیئے مرغی والے کو۔ یہ تو درمیان میں بات آگئی تھی۔

نانی کا رشتہ بھی کم عجیب و غریب نہیں۔ کسی عورت کو نانی کہہ کر پکارنے کی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ جوتی لے کر مارنے کو دوڑے گی۔ نانی کہنے سے ایک ایسی عورت کا تصور ہوتا ہے جو بوڑھی نہیں تو ادھیڑ ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں نانی ہو جانے پر بھی نانی کہلانا پسند نہیں کرتیں۔ اس طرح اپنی عمر کم بتانے میں ان کو دشواری ہوتی ہے۔

پتہ نہیں نانی مرے کا استعمال کب سے شروع ہوا ہے جو ضرب المثل بن گیا ہے۔ ایک طالب علم امتحان گاہ سے نکل کر کہتا ہے۔ سوال اتنا بھاری تھا کہ جیسے نانی مر گئی۔ اور دفتر میں کام کرنے والوں کی تو روز ہی نانی مرا کرتی ہے۔ خاص کر جب ٹیبل پر کام بہت زیادہ ہو۔ ایسے سرکاری ملازمین

کی دوران ملازمت کم از کم بیس پچیس مرتبہ تو ضرور ہی نانی مرتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب بھی چھٹی کی ضرورت ہوئی اپنی درخواست میں نانی کو دے مارا۔

یہ لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میری نانی سخت علیل تھیں۔ اس روز شدت کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں صبح سویرے نہا کر غسل خانہ سے نکلا تو سردی کا شدید احساس ہوتے پر میں بول اٹھا۔ اف! پانی اس قدر سرد تھا کہ میری نانی مر گئی۔ یہ کہنا تھا کہ گھر کے اندر کہرام مچ گیا۔ نانا جان بے ہوش ہو گئے۔ اور والدہ گرتے پڑتے نانی کے کمرے کی طرف دوڑیں۔

اور سالے کے رشتے کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ میرا ہی ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کوئی محبوب کہتا ہے کوئی مطلوب کہتا ہے
تماشا بزم میں دیکھے کوئی بیگم کے بھائی کا

میں ایک حضرت سے ملنے گیا۔ وہ اپنے سالے سے باتیں کر رہے تھے مجھ سے مصافحہ کے بعد انھوں نے فرمایا۔ آپ ان سے بھی ملیں یہ ہیں میرے سالے۔ یہ سن کر سالے صاحب چراغ پا ہو کر بولے۔ تم سالے اپنی حرامزدگی سے باز نہ آؤ گے۔ کسی کا سالا ہونے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اس کا اعلان لاؤڈ اسپیکر پر کیا جائے

یہ تو سالے اور بہنوئی کی بات ہوئی لیکن اس رشتے کا استعمال غصہ کی حالت میں بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ مارو سالے کو۔ حالانکہ وہ سالا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اکثر لوگوں کو گفتگو کے دوران سالا کہنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک سپاہی نے اسی عادت کے مطابق دوسرے سپاہی کو سالا کہہ دیا۔ اس نے اپنے افسر اعلیٰ سے شکایت کی جب اُن سے کیفیت طلب کی گئی تو اس نے جواب دیا۔ حضور میں کبھی کبھی اس سالے کو سالا کہہ سکتا ہوں۔

سالا کی طرح سالی کا استعمال کبھی غصہ کی حالت میں کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ وہ سالی بڑی حرامزادی ہے۔ حالانکہ وہ اس کی سالی نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ سالا اور سالی سے مذاق کا رشتہ کیوں اور کب سے قائم ہوا۔ بھلا یہ بھی کوئی رشتہ ہے

کہ دولہا یا بیوی کو سالا اور سالی کے مذاق کا تختۂ مشق بننا پڑے اور مذاق بھی ایسا کہ غریب کو دن میں تارے نظر آجائیں۔ یہاں یہ ضرور ہے کہ سالی کا رشتہ بڑا اہمیت کا حامل ہے۔ سالی کو ایزرو Reserve کوٹا بھی کہتے ہیں۔ اِدھر اہلیہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا نہیں کہ اس ریزرو کوٹا سے ایک سالی یہ آسانی عقد نکاح میں آجاتی ہے جس کو عورتوں کی زبان میں گھر پلیٹ کہتے ہیں۔

رشتوں میں کٹر یل رشتہ ساس اور سسر کا ہے۔ تب یا نہ ہے یہ بھی ان کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان دونوں رشتوں کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ ساس اور سسر کے قبل نینا خلیا جوڑتے جائیں رشتے کی ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔

دیگر رشتوں کی طرح سالوں کی بھی چند قسمیں ہیں۔ میرے سالے نے اپنے سالا کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ یہ ہیں میرے لٹر دھو سالا۔ میں نے ان کے کہنے سے لٹر دھو سالا تو الحقیقت تسلیم کر لیا۔ لیکن آج تک یہ نہ سمجھ سکا ہوں کہ لٹر دھو سالا کے معنی کیا ہیں۔ اور سالے کا سالا لٹر دھو سالا کیوں کہلایا۔ جب رشتے کے حساب سے لٹر دھو سالا ہو سکتا ہے تو لٹر دھو سالی بھی ضرور ہوتی ہوگی۔ لیکن آپ کی دعا سے ابھی تک لٹر دھو سالی سے میرا واسطہ نہیں پڑا ہے۔



سنہ دو ہزار عیسوی میں برپا ہونیوالے مشاعروں کی ایک جھلک

وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے رسم و رواج بدلتے ہیں۔ طرز رہائش بدلتی ہے اور فیشن بدلتے ہیں۔ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ بھلا ہمارے مشاعرے اس سے کیوں مستثنیٰ رہتے۔ ان کے اندر بھی تبدیلیاں آئیں ...... ایک دور وہ بھی تھا جب مشاعرے معزز شعرا اور سامعین کرام کی مختصر بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ شعرا جس عزت و احترام سے بلائے جاتے اسی عزت و احترام کے ساتھ واپس ہوتے۔ نہ ہوٹ پ۔ نہ فقرے بازیاں اور نہ ہوٹنگ پھر اس مشاعرے کی بگڑی ہوئی صورت سامنے آئی نہ شعرا کی عزت سلامت اور نہ سامعین کی عزت محفوظ ہر لحظہ یہ خطرہ کہ کب کس کی پگڑی اچھالی جاتی ہے اور کب کس شاعر کا قافیہ تنگ ہوتا ہے۔

مشاعروں کی بدترین صورت سنہ دو ہزار عیسوی تک آنے والی ہے۔ یہ کوئی پیشین گوئی نہیں بلکہ قیاس آرائی ہے۔ اس دور کے مشاعروں میں ڈائس پر طبلہ سارنگی اور ہارمونیم کا خاص اہتمام رہے گا۔ شعرا حضرات لنگا شلوار اور پشواز پہن کر ڈائس پر تشریف فرما ہوا کریں گے۔ اور اوڑھنیاں اوڑھ کر کلام سنایا کریں گے۔ نقیب مشاعرہ ایک ایسی بوڑھی نائکہ ہوا کرے گی جو شعرا کی راگ، راگنیوں اور ان کی گلوکاریوں پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ شعرا کو ان کے سازندوں اور طبلچیوں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ شعرائے کرام دیز تک سُر تال ملاتے کے بعد غزل سرا ہوا کریں گے۔ سامعین کی جانب سے عموماً گیت کی فرمائش ہوا کرے گی ڈائس پر شعرائے کرام کے آگے اور پیچھے اتنی جگہ رہا کرے گی کہ وہ اپنے اشعار پر تھرک تھرک کر

اور بھاؤ بتا بتا کر سنا سکیں۔ ساتھ ہی دوران غزل خوانی وہ رقص بھی کرتے جائیں گے۔ تحت لفظ پڑھنے والے شعراء کبھی کمر پہ اور کان پر ہاتھ رکھ کر غزلیں سنائیں گے۔ اس دور میں غزل گا شعراء کی بڑی قدر و منزلت ہوگی اور غزل گو شعراء منہ چھپائے پھریں گے۔ زیادہ تر شعراء خود ہی ہارمونیم بجا کر کلام سنانا پسند کریں گے۔ طبلچی اور سارنگی بجاتے والے ان کا ساتھ دیں گے۔ اگر کسی سر پھرے شاعر سے غالب کی زمین میں غزل سرا ہونے کی حماقت سرزد ہوگی تو اس پر گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹر کی بارش ہونے لگی۔

شعراء کو معقول معاوضہ کے علاوہ انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ انعام و اکرام کا مستحق وہی شاعر ہوگا جو گانے، تھرکنے، ہارمونیم بجانے، بھاؤ بتانے اور رقص کرنے میں سب سے بازی لے جائے گا۔ اس دور کے مشاعروں میں واہ واہ یا مکرر ارشاد کی صدائیں سنائی نہ دیں گی۔ سامعین ڈائس پر پیسے پھینک کر داد سخن دیا کریں گے۔ جسے شعراء اشعار سنانے کے دوران بٹور بٹور کر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل میں باندھتے جائیں گے۔

نظامت کرنے والی نائکہ آخر میں اعلان کیا کرے گی کہ کس شاعر کو کتنی چھوٹ سے نوازا گیا۔

اختتام مشاعرہ پر ڈائس پر بیٹھے سبھی شعراء اپنی اوڑھنیاں اوڑھ کر کورس کے انداز میں گیت گا کر سامعین کو محظوظ فرمائیں گے۔



مجھے کیا بُرا تھا مرنا

آخر میری ڈوبتی ہوئی نبض پر سے اپنا دستِ شفا سمیٹ کر حکیم صاحب منہ لسوڑ کر بولے - اب مریض کا اللہ ہی حافظ ہے۔ بہتر ہوتا کہ مریض کو قبلہ رو کر دیا جائے۔ ویسے اپنے طور پر میں نے مریض کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن اللہ کی مشیت کے آگے انسان مجبور ہے حکیم صاحب کا یہ اظہارِ مایوسی کرنا تھا گھر کے اندر کہرام مچ گیا۔ حکیم صاحب کی اس حرکت پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ یہی جی چاہا کہ اٹھ کر ان کا منہ نوچ لوں کہیے تو بھلا جب میں مر ہی رہا ہوں تو قبل از وقت دل دہلا کر بین ڈلوانے میں کون سی عقلمندی تھی۔ اگر تسلی آمیز دو جملے کہے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ کیونکہ مثل مشہور ہے - جب تک سانس تب تک آس - لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ حکیم صاحب کے پیٹھ پھیرتے ہی مجھے زور کی ایک ہچکی آئی - اور میرا انتقال ہو گیا - میرا دم بڑی آسانی سے نکلا - مجھے صرف ایک جھٹکا سا لگا جس کے ساتھ ہی میں نے خود کو اپنے جسمانی خول سے الگ کھڑا ہوا پایا - اپنے جسدِ خاکی کو دور سے دیکھ کر میں نے سوچا کیا ستر سال سے میں اسی ڈھانچے کے اندر مقید تھا۔ اس قید سے رہائی پر مجھے بڑی مسرت کا احساس ہوا۔ اور ادھر میرے انتقال پر میرے اعزا میں مٹس پڑی تھی انہیں سینہ کوبی کرتے دیکھ کر میرا کلیجہ بھی پھٹنے لگا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ارے بھائی تم لوگ کس کے لئے رو پیٹ رہے ہو وہ تو میں ہوں جو ادھر کھڑا ہوں ...... میری طرف دیکھو - مجھے پہچانو - اور میری باتیں سنو - میرے لئے ایسے رونا دھونا بے کار ہے - میں لوٹ کر آنے کا نہیں - ایسا ہی ہے تو میرے لئے دعائے مغفرت کرو - لیکن میری باتیں سنتا تو درکنار کسی کو وہاں میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا - جب گھنٹوں بعد میرے اعزا کا رونا پیٹنا کم ہوا تو میری تجہیز و تکفین کی باتیں ہونے لگیں - اسی

دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ جیسے مجھ میں طاقت پرواز ہے اور میں پرندوں کی طرح فضا میں اڑ سکتا ہوں۔ اور واقعی اسی تیز رفتاری سے فضا میں اڑا کہ ایک تیز رفتار ہوائی جہاز مجھ سے بازی نہ لے جا سکا۔ اب تو نہ پوچھئے میری خوشی کا عالم۔ فضائے آسمانی کے سینکڑوں میل کا چکر لگانے کے بعد سکریٹریٹ کے اس بلند ٹاور پر اتر گیا جس میں گھڑی نصب ہے۔ اور وہاں سے جو بھی اڑان بھری تو گاندھی سیتو پر کچھ دیر چہل قدمی کر کے پرواز کرتا ہوا گھر واپس آیا تو دیکھا کہ خلیفہ جی کفن سی رہے ہیں۔ مسہری بھی لاکر رکھی ہے۔ اور بھاڑے کے غسال میرے مردہ جسم کو غسل دے رہے ہیں۔ غسل کے بعد کفن کو پوری ایک شیشی عطر سے معطر کیا گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے جھک کر میت کے کان میں کہا ۔۔۔ کمو دوست زندگی میں تو عید اور بقر عید میں عطر صرف سونگھنے کو ملتا تھا۔ اور آج مر کر یہ ٹھسہ ہے کہ عطر کی پوری شیشی سے تمہارے کفن کی پوتا ئی کی جا رہی ہے۔

جنازہ تو تیار ہی تھا لیکن معلوم ہوا کہ جنازہ اٹھائے جانے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ تو میں نے سوچا چلو فضائے بسیط کا دو چار چکر اور لگا لوں۔ پھر خیال آیا کہ اس دوران کہیں لوگ جنازہ لے کر نکل نہ جائیں۔ لہذا گھر ہی میں رہنا مناسب سمجھ کر اپنی لائبریری میں کچھ دیر مطالعہ کے بعد اپنے ردم میں آیا۔ وہاں عیادت کے لئے آئے ہوئے کچھ لوگ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ انھیں میں سے کسی نے کہا۔ مرحوم بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی وضعداری کا یہ عالم کہ ایک وضع جو اختیار کر لی تو اس پر تا دم آخر قائم رہے۔ گرمی میں سفید شیروانی اور جاڑے میں سیاہ شیروانی ان کا مخصوص لباس تھا۔ جس میں کبھی فرق نہ آیا۔ اپنی وضعداری کے متعلق خود مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

اک وضع پہ تا عمر میں قائم رہا گرچہ
رنگ اپنا بدلتی رہی دنیا مرے آگے

تب ہی یکایک میری نظر اپنی شیروانی پر پڑی۔ جو ہینگر میں ٹنگی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بے ساختہ میری خواہش پہننے کی ہوئی۔ میں نے بڑھ کر شیروانی ہینگر سے اتاری اور اسے پہن کر ہال میں ٹہلنے لگا میری شیروانی کو بغیر کسی سہارا کے متحرک دیکھ کر سوگواروں پر دہشت طاری ہوئی

جب ان کے ہوش بجا ہوئے تو پیش امام صاحب اپنے اوپر کچھ دم کر کے بولے۔ شیر دانی کا آپ سے آپ ہینگر سے نکل کر حرکت میں آنا کوئی معمولی بات معلوم نہیں ہوتی۔ جسے نظر انداز کر دیا جائے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کرشمہ ہاشم عظیم آبادی مرحوم کی بے چین روح کا ہے۔ لہٰذا کفن کے اوپر سے ان کی یہ دلپسند شیر دانی پہنا دینا ہی قرین مصلحت ہے۔ ان کی رائے سے اتفاق کر کے میری شیر دانی مجھے پہنا دی گئی۔ اب موذن صاحب نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جب شیر دانی پہنا دی گئی ہے تو مرحوم کو ان کے جوتوں سے کیوں محروم رکھا جائے۔ اس رائے سے بھی اتفاق کر کے مجھے جوتے پہنا دیئے گئے۔ عبادت کرنے والوں میں ایک شاعر بھی تھے۔ انہیں دور کی سوجھی تو ترنم کے ساتھ بولے۔ ہاشم مرحوم کی بصارت بہت کمزور تھی۔ وہ عمر بھر چشمہ لگاتے رہے ظاہر ہے کہ بینائی کی کمزوری کی وجہ کر قبر کی کھڑکی سے دودھ اور شہد کی نہریں دیکھنے میں اور حوران جنت کے حسن جہاں سوز سے لطف اندوز ہونے میں بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ مرحوم کو چشمہ بھی لگا کر اس کمی کو بھی پورا کر دیا جائے۔ اس مشورہ کو عملی جامہ پہنانے میں میرے اعزا کو ہچکچاہٹ تھی۔ کیونکہ آج تک کسی کو چشمہ لگا کر دفنایا نہ گیا تھا۔ پھر بھی ہاں نہیں کے بعد میرے جسد خاکی کو چشمہ بھی لگا دیا گیا۔۔۔

۔۔۔ کچھ دیر بعد زور زور سے کلمہ پڑھنے کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ مسہری اٹھائے جنازہ لئے جا رہے ہیں۔ میں بھی لپک کر ساتھ ہو لیا راستہ میں سوچا مجھ سے اچھا تو یہ خاکی پتلا ہی رہا۔ اس وقت کیا ٹھاٹھ ہیں اس کے۔ آرام سے مسہری پر دراز چار لوگوں کے کندھوں پر چلا جا رہا ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ پیر گھسیٹے چل رہا ہوں پھر لوگوں کو باری باری کندھا دیتے دیکھ کر میری خواہش بھی کندھا دینے کی ہوئی۔ میں نے بڑھ کر مسہری کی بائیں جانب کندھا دیا تو جو حضرت پہلے سے کندھا دیئے ہوئے تھے۔ کسی انجانے خوف سے مسہری کا پایا چھوڑ کر چیختے ہوئے بھاگے ان کی یہ چیخ سن کر پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کندھا دینے کو بڑھے مجبوراً میں ہی کندھا دیئے رہا۔ کیونکہ اگر اس طرف کا پایا چھوڑتا ہوں تو مسہری ڈس بیلنس ہو کر مردہ زمین پر گر جاتا اور ادھر لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ مسہری صرف تین شخصوں کے سہارے ہونے کے باوجود بائیں جانب کوئی جھکاؤ نہیں۔ لیکن میرا تو برا حال ہو رہا تھا۔ مگر کرتا ہی کیا تھا

یہ مصیبت میں نے خود ہی مول لی تھی - خدا خدا کر کے جنازہ گورستان پہنچا - اور میں نے راحت کی سانس لی -

اب مجھے اپنے کردہ گناہوں کا خیال آیا - اور یہ بھی کہ قبر میں منکر نکیر کے سوال و جواب کا سامنا ہوگا پہلے تو مجھ پر دہشت سی طاری ہوئی - اور بدن میں لرزہ بجا - اور پھر اس خیال سے اطمینان ہوا کہ قبر میں پوچھے جانے والے سوالات تو پہلے ہی سے آوٹ ہیں - تشفی بخش جواب دے کر اچھے نمبر سے پاس کروں گا - اور اگر گناہوں کی پاداش میں دھر پکڑ ہوگی بھی تو بہانہ تراشی سے کام لے کر صاف صاف کہہ دوں گا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی میرا وہاں پر دمِ تحریر بھی تھا

میں انھیں خیالات میں گم تھا کہ میرے جسد خاکی کو قبر میں اتار کر منہ کھول دیا گیا کہ جس کا جی چاہے ہاشم عظیم آبادی کا آخری دیدار کر لے - میں بھی اسی ہجوم میں قبر کے کنارے کھڑا تھا - ابھی پٹوں برابر ہی کیا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اتنی زور سے مجھے دھکا دیا کہ میں منھ کے بل آنا رہا قبر کے اندر دھکا کھا کر قبر میں گرتا تھا کہ میری نیند ٹوٹ گئی - اور میں کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا -



ملک الموت سے انٹرویو

میں :۔ وعلیکم السلام ۔ مگر معاف کیجئے گا ۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو

ملک الموت :۔ میں ملک الموت ہوں

میں ـــ اِیں ! ملک الموت ہو بھی بہ شکل انسان ہائے ابھی تو نہ تھے میرے مرنے کے دن

ملک الموت :۔ مرنے کے دن نہیں ہوا کرتے حضرت موت کسی وقت بھی آسکتی ہے ۔

میں :۔ تو آپ کس ارادے سے تشریف لائے ہیں ملک الموت بھائی ۔

ملک الموت :۔ تم مجھے بہت یاد کرتے تھے ۔ اس لئے چلا آیا ۔

میں :۔ یہ تو ٹھیک ہے ڈیر ملک الموت لیکن آپ کو یاد کرنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ آپ اچانک یہ نفس نفیس تشریف لے آئیں ۔ میرا گلا خشک ہوتا جا رہا ہے ۔ ذرا ایک گلاس پانی پی لوں دوست ۔

ملک الموت :۔ یقین دلاتے پر بھی کہ میں روح قبض کرنے نہیں آیا ہوں تم اس قدر نروس ہو رہے ہو کہ مجھے کبھی بھائی کہتے ہو تو کبھی دوست ۔ لیکن یاد رہے مسٹر کہ میں نہ کسی کا دوست ہوں اور نہ کسی کا بھائی ۔

میں :۔ اب مجھے یقین آگیا کہ آپ میری روح قبض کرنے نہیں آئے ہیں ۔ لہذا میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں ...... یہ آپ کھڑے کیوں ہیں ۔ تشریف رکھیں ۔ آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چند سوالات کرنا چاہوں گا ۔

ملک الموت :۔ شاید تمہارا مطلب میرا انٹرویو لینے سے ہے ۔ کوئی بات نہیں پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو

بیر :- یہ بتائیں ملک الموت صاحب کہ آپ جان کس طرح نکالتے ہیں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ روح قبض کرنے کا جو طریقہ کار ہو اس کی وضاحت کرتے ۔

ملک الموت :- تم میرا طریقہ کار نہ سمجھ سکو گے ۔ اس کی وضاحت ہی لاحاصل ہے ۔

بیر :- اچھا تو میری خاطر صرف اتنا کریں کہ اپنے طریقہ کار کا ایک ہلکا سا جھٹکا ہی مجھے لگائیں ۔

ملک الموت :- یہ تو ممکن نہیں مسٹر ہاشم ۔ روح قبض کرنے کا ایک ہلکا سا مظاہرہ بھی تم پر کروں تو مجھ سے کیفیت طاب ہو سکتی ہے ۔

بیر :- سنتے ہیں روح نکلنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ جب میرے مرنے کا وقت آئے تو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر روح قبض کرنے کا طریقہ استعمال کریں تاکہ مجھے تکلیف کا احساس نہ ہو ۔

ملک الموت :- ارے میاں مجھے اصلی شکل میں دیکھتے ہی انجکشن لگانے بغیر بے ہوش ہو جاؤ گے ۔

بیر :- اچھا تو یہ بتائیں کہ میری موت کب اور کس جگہ واقع ہوگی ۔

ملک الموت :- یار ۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا ۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی کی زندگی کے دن پورے ہونے کے چند لمحہ قبل بذریعہ وائرلس مجھے خبر دی جاتی ہے اور میں اس کی روح قبض کر لیتا ہوں ۔

بیر :- ملک الموت صاحب پوری دنیا کے لئے ایک آپ ہی قابض ارواح ہیں ۔ بڑی دقت ہوتی ہوگی آپ کو

ملک الموت :- دقت تو ضرور ہوتی ہے ۔ مگر کرنا کیا ہے ۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی ۔

بیر :- کیا روح قبض کر کے بعد سے عالم بالا بھیج دیتے ہیں ۔

ملک الموت :- کرتا تو ایسا ہی تھا لیکن آبادی بہت بڑھ جانے کی وجہ سے ڈاکخانہ کے اصول کے مطابق کام کرنے لگا ہوں ۔ یعنی دن بھر میں جتنی روحیں قبض کرتا ہوں ان کو ایک تھیلے میں جمع کرتا جاتا ہوں ۔ اور شام کو ان تھیلوں پر پتہ لکھ کر ڈسپیچ کر دیتا ہوں

بیمہ : روح قبض کرنے میں آپ کو رحم بھی آیا کبھی -

ملک الموت : اگر رحم کرتا پھروں تو کر چکا ڈیوٹی -

بیمہ : آپ کی تشریف آوری سے گھبراہٹ کے بعد جو مسرت ہو رہی ہے وہ دائرۂ بیان سے باہر ہے - کیا آپ ٹھنڈا لینا پسند کریں گے یا گرم -

ملک الموت : یہ ٹھنڈا اور گرم تم ہی کو مبارک ہو - ہم لوگ اس جھنجھٹ سے بے نیاز ہیں -

بیمہ : اور آخر میں یہ بتائیں کہ ہر ذی روح کی روح آپ قبض کرتے ہیں - آپ کی روح کون قبض کرے گا -

ملک الموت : ارے یہ کیا سوال کر دیا تم نے - ساتھ ہی ان کا چہرہ زرد پڑ گیا - اور زبردست لرزہ طاری ہوا - جب ہوش بجا ہوئے تو وہ بولے - ہاشم صاحب موت ایسی خوفناک اور دل ہلانے والی ہے کہ تمہارے یاد دلانے پر مجھ پہ لرزہ طاری ہو گیا - اور وہ بھی اس شدت سے کہ وہ تھیلا جس میں روح قبض کر کے جمع کرتا جا رہا تھا ہاتھ سے چھوٹ گیا - اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سی روحیں نکل بھاگیں لیکن اطمینان یہ ہے کہ یہ بھگوڑی روحیں بھاگ کر جائیں گی کہاں -

بیمہ : ملک الموت صاحب کوئی ایسی نصیحت کرتے جو میرے حق میں مفید ہو -

ملک الموت : تو سنو اور اپنے پلے باندھ لو -

جب تم آئے جگت میں جگت ہنسا تم روئے
کرنی ایسی کر جاؤ تم ہنسو اور جگ روئے



جوہر سیوانی
جوہرِ ظرافت کے آئینے میں

جوہر سیوانی نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو خوش قسمتی سے ان کو ایک ایسے استاد مل گئے جو غزلیں لکھ دیا کرتے تھے ایسا شفیق استاد وفات پا جائے تو شاگرد دیوکھلا ہی جائے گا جوہر فرماتے ہیں۔

استاد میرے دیتے تھے لکھ کر مجھے غزل
وہ چل گئے وفات خدایا میں کیا کروں

شعر کہنے کے لئے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ایسے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی چاہے گھر والی ہی کیوں نہ ہو غزل کہتے وقت اگر بیگم آجائیں تو جوہر برہم ہو کر کہتے ہے

بیگم چلی بھگا دُ غزل کہہ رہا ہوں میں
للہ سر نہ کھاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں

اکثر ایسا ہوتا کہ مصرعۂ اول پہ دوسرا مصرعہ لگ ہی نہ پاتا۔ جوہر کروٹ پر کروٹ بدل کر پوری پوری شب گزار دیتے ہے

مصرعۂ اول پر لگ پایا نہ مصرعہ دوسرا
کروٹیں لے لے کے ہم نے شب گزاری ہائے ہائے

بے روزگاری اور بیکاری کو جوہر خدا کی رحمت سے تعبیر کرتے۔ اس طرح انہیں طبع آزمائی کا خوب موقع ملتا۔ بے روزگاری کا ہر دن انھیں اتوار کی طرح پر لطف معلوم ہوتا ہے ہے

بے روزگار ہوں تو یہ رحمت خدا کی ہے
ہر دن ہے میرے واسطے اتوار کی طرح

بیگم کی دھمکیوں سے تنگ آ کر جوہر نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا۔ پھر بھی چوری چھپے جاتے رہے۔ ایک دن مشاعرہ کے پنڈال میں بیگم ٹھیک اس وقت بلائے بے درماں کی طرح پہنچ گئیں جب کہ جوہر مائک پر غزل سرا تھے۔ بیگم کی صورت پر نظر پڑتے ہی جوہر بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر التماس کرنے لگے۔

مجھے اے خدا بچا لے تو بلائے بے اماں سے
کہ مشاعرہ میں آخر وہ پہنچ گئیں کہاں سے

بیوی کے ساتھ اگر سات عدد سالے بھی مل جائیں تو یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ اُدھر سالوں کی فوج اور اِدھر جوہر کی اکیلی جان۔ وہ کریں تو کیا ؎

بھائی ہیں ان کے سات خدایا میں کیا کروں
اور میں اکیلی جان خدایا میں کیا کروں

سات عدد سالوں کے علاوہ خدا نے جوہر کو ایک درجن سالیوں سے بھی نوازا تھا ظاہر ہے کہ سسرال میں کیا کیا دلداریاں نہ ہوتی ہوں گی ؎

بھلا سسرال میں کیوں کر نہ ہوں، دلداریاں میری
خدا کے فضل سے ہیں ایک درجن سالیاں میری

ایک درجن سالیاں ہوں تو چھیڑ خوانیاں بھی ہوتی ہی ہوں گی لیکن سالیوں سے چھیڑ خوانی میں جوہر ہمیشہ گھاٹے میں رہے۔

سالیوں سے چھیڑ خوانی کیا ہوئی
درجنوں رومال غائب ہو گئے

میاں بیوی میں نوک جھونک ہو جائے تو سالوں کو کیا حق ہے کہ جھگڑے میں ٹانگ اڑا کر بہن کی طرفداری میں بہنوئی سے بگڑ اٹھیں جس سے ذرا سی بات بڑھ کر کہاں سے کہاں

پہنچ جائے۔

ہوا اہلیہ سے جھگڑا اگر اٹھے میرے سالے
یہ ذرا سی بات بڑھ کر کہاں تک گئی کہاں سے

پتہ نہیں سالیوں سے چھیڑ خوانی میں جوہر سے کیا چوک ہوئی کہ حسن کی چنگاری سے کبھی نہ کھیلنے کا عہد کرنا پڑا۔

باز آئے کبھی سالی کو چھیڑا نہ کریں گے
ہم حسن کی چنگاری سے کھیلا نہ کریں گے

سالیاں اگر حسن کی چنگاریاں ہوں تو ظاہر ہے بڑی بہن یقیناً دوزخ کا لپکتا ہوا شعلہ ہوگی۔ اب اگر بیگم کا سامنا ہوتے پر جوہر کو پیاس لگتی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

بیگم ہیں کہ دوزخ کا لپکتا ہوا شعلہ
جب سامنا ہوتا ہے مجھے پیاس لگے ہے

بیگم کے زیورات سالوں کے پاس امانت رکھنا غیر دانشمندانہ بات تھی۔ اگر وہ بے ایمان سالے جوہر کے زیورات ہضم کر گئے تو صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

سالوں کے پاس رکھے تھے وہ ہضم کر گئے
بیگم کے زیورات خدایا میں کیا کروں

سات عدد بگڑے دل سالے۔ گھر والی دوزخ کا لپکتا ہوا شعلہ۔ لڑائی جھگڑے سے ناطقہ بند بیگم کا سامنا ہونے پر پیاس لگے۔ درجنوں سالیاں رومال غائب کرنے پر تلی ہوئی۔ تو بہ کیا ضیق میں جان ہوگی جناب جوہر کی۔

بیگم سے لڑائی کے سبب ناطقہ بند ہے
سالی مرے پیچھے ہے تو سالا مرے آگے

کسی نے پوچھا ہوگا تب ہی تو جناب جوہر فرماتے ہیں۔

کیا کہوں چلتی ہے کیسے میری بیوی کی زباں

دن میں قینچی کی طرح اور شب میں بھالے کی طرح

آنولے کا مربّہ کھا کھا کر بیگم کا جسم ہاتھی کے بدن جیسا ہو گیا تھا ممکن ہے جوہر کے سالوں نے یہ نسخہ اپنی بہن کو بتایا ہو۔ حقیقت جو بھی ہو جب جوہر بہ قید ہوش و حواس اظہار حقیقت کر رہے ہیں تو یقین کرنا ہی پڑے گا۔

کھا کے آنولے کا مربّہ ہو گئیں ایسی موٹی

جسم بیگم کوئی ہاتھی کا بدن ہو جیسے

نہ جانے بیگم کو کیا ضد تھی کہ اپنا سایہ رہتے ہوئے جوہر کی لنگی پہنے پھرا کرتیں وہ بھی ایک دن ہو تو ہو۔ روز یہ حرکت دہرائی جاتی ہے

سایا کی جگہ میری لنگی ہی پہنتی ہیں

اک دن نہیں روزانہ لاحول ولا قوۃ!

داماد کسے پیارا نہیں ہوتا۔ وہ بھی جوہر ایسا پیارا داماد۔ ساس نے اپنی ساری جائیداد جوہر کے نام کر دی۔ ساس کے اس کرم کو جوہر لاٹری سے تعبیر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ساس نے کر دی ہے میرے نام ساری جائیداد

میرے حق میں اس کرم کو لاٹری کہیے جناب

جوہر نے ننکلاٹ خرید کر پاجامہ سینے کے لئے درزی کو دیا۔ اس ستم ظریف نے مشین پر کچھ ایسی شاعری کی کہ پاجامہ شلوار کی طرح سل گیا ہے

درزی نے کی مشین پہ کچھ ایسی شاعری

پاجامہ میرا سل گیا شلوار کی طرح

شادی کے قبل خطوط محبت جلا دینا ہی قرین مصلحت ہے۔ لیکن غلطی سے سارے خطوط محبت دراز میں پڑے رہ گئے اور ادھر بیوی رخصت ہو کر آ گئیں۔ جوہر پھیر میں پڑ گئے مگر بیگم کے میکہ جاتے ہی جوہر سارے خطوط محبت جلانے بیٹھ گئے۔ کسی نے ٹوکا

تو جوہر نے جواب دیا ؎

وہ دیکھ لیں گی تو کر دیں گی ایک حشر بپا
یہ ہیں خطوط محبت انھیں جلانے دو

بیوی اگر بانجھ ہو تو یہ دوسری بات ہے ورنہ اولاد خدا کی دین ہے۔ ہر سال ولادت ہو سکتی ہے۔ چاہے میاں کا حال پتلا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اہلیہ کو اس ڈانکہ کیوں ہونے لگی بھلا ؎

پتلا ہے میرا حال مگر اہلیہ کو کیا
ہر سال لازمی ہے ولادت نہ پوچھئے

نو عدد بچوں تک تو جوہر نے صبر سے کام لیا لیکن دسویں کی آمد پر یارائے صبر نہ رہا۔ سر پیٹ کر رہ گئے۔ ہائے اب کیا ہوگا ؎

میں نے تو رمضان رکھا تھا نویں لڑکے کا نام
آج دسواں آگیا قربان، اب کیا کیجئے

قرینہ اغلب ہے کہ دسویں کے بعد گیارہواں بھی آگیا۔ تب ہی تو جوہر اہلیہ سے شکایت کر رہے ہیں۔

ہر سال یہی کہتی ہو جب ہوتا ہے بچہ
اب اگلے برس ہم یہ تماشا نہ کریں گے

احباب نسبندی کرا لینے کو کہتے رہے۔ لیکن جوہر نے کسی کی بات نہ مانی۔ بیگم نے بھی جب یہی مشورہ دیا تو جوہر کی سمجھ میں بات آئی کہ بیگم کا خیال اچھا ہے ؎

وہ بھی کہتی ہیں کہ نسبندی کرالو صاحب
کیوں نہ مانوں مری بیگم کا خیال اچھا ہے

کہتے ہیں سر کے بال تفکرات سے جھڑ جاتے ہیں لیکن جوہر کا تجربہ ہے کہ گنجا پن کثرت اولاد کی علامت ہے۔ وہ اپنی ہی مثال پیش کرتے ہیں ؎

کثرتِ اولاد کا انجام دیکھ
سر کے سارے بال غائب ہو گئے

پریشانی آتی ہے تو ہر طرف سے یہاں تک کہ محلے کے کرائے دار کبھی ایسے چور اچکے نکلے کہ جوہر کی مرغیاں ایک ایک کر کے چٹ کر گئے ؎

کرائے دار اچھے آ گئے اپنے محلے میں
چرا کر کھا گئے ہائے ایک کر کے مرغیاں میری

جوہر کفایت شعاری کو بڑا دیتے رہیں ایک دن دفتر سے لوٹتے وقت ایک معمولی جمپر بیگم کے لئے خرید تے لائے لیکن اس جمپر کا جو حشر ہوا وہ جناب جوہر کی زبانی سنئے ؎

معمولی جمپر دیکھ کر بیگم کو غصہ آ گیا
پھینکا زمیں پر پھاڑ کر آدھا ادھر آدھا اُدھر

ایک دن نہ جانے بیگم کو کس بات پر اس قدر غصہ آیا کہ اپنے میاں کو بھاڑ میں جھونکنے جا رہی تھیں - وہ تو خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ عین وقت پر ایک پڑوسن آ گئی جس نے بیگم کو سمجھایا ؎

نہ جھونکو بھاڑ میں اپنے میاں کو
ابھی وہ بھاڑ کے قابل نہیں ہے

ممکن ہے بیگم کی یہ خفگی کسی فرمائش کے پوری نہ ہونے پر ہوئی - تب ہی تو جناب جوہر شادی کو جنجال سمجھ رہے ہیں ؎

فرمائش بیگم سے تو میں تنگ ہوں جوہر
جنجال یہ شادی یہ خدا میرے لئے ہے

شادی جنجال کیوں نہ ہو جب کہ بیگم کا مزاج ایسا کہ آپے سے باہر ہو جائیں تو کبھی چولہا توڑ دیں تو کبھی ہانڈی پھوڑ دیں ؎

توڑا گیا چولہا کبھی پھوڑی گئی ہانڈی
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بیگم جب شوہر ہی کو کچھ نہ سمجھیں تو بھابھی سے کیا خاک بنھ سکتی تھی۔ خوب جم کر لڑائی ہوتی دونوں میں ہے

بھابھی سے کبھی بیگم کی نہیں بنتی ہے اک دن
منظر ہے وہی لوک سبھا کا مرے آگے

بے روزگاری اور شاعری ساتھ ساتھ چلے تو قرض کی نوبت آہی جاتی ہے قرض اور وہ بھی کابلی خاں سے خدا بچائے۔ وقت پہ پیسے نہ ملیں تو کابلی خاں درگت بنانے سے بھی نہیں چوکتے ہے

نوچ لی مونچھ میری چہرا بگاڑا میرا
کابلی خاں نے بنا ڈالی یہ درگت میری

سالے۔ سالیوں۔ بیگم۔ کابلی خاں اور محلّہ کے چودھرانہ داروں کے ہاتھوں دکھ جھیلتے جھیلتے جوہر انتقال فرما گئے۔ اُسے خوش قسمتی کہئے کہ یہی دکھ جھیلنا ان کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔ اور جناب جوہر دوڑے فردوس بریں کی طرف۔ مگر وہاں تو پہلے ہی سے مولویوں کا قبضہ تھا۔ وہ تو کہئے کہ دوزخ میں تھوڑی جگہ مل گئی جو گزارا ہو گیا۔ ورنہ کہاں جاتے بیچارے ہے

درِ فردوس پہ تو مولویوں ہی کا قبضہ تھا
اگر ہوتا نہ دوزخ میں گزارا ہم کہاں جاتے



احوالِ غالبؔ بزبانِ غالبؔ

کہتے ہیں کہ غالب کے سینہ میں تپشِ عشق کے باعث ایک بہت بڑا زخم ہو گیا۔ جس میں عمل جراحی ان کے معشوق کی موجودگی میں کی گئی۔ لیکن وہ اتنا سنگ دل نکلا کہ نہ [illegible] اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی ایک قطرۂ آنسو آنکھ سے نہ ٹپکا۔ غالب تو اس کی بے [illegible] ہوا۔ انہوں نے کراہتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

غالبؔ کسی کے ہاتھ میں تلوار دیکھتے تو فوراً اپنی گردن جھکا دیتے۔ کسی نے وجہ دریافت کی تو غالبؔ نے یوں وضاحت کی ؎

شہادت میری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا ہوں گردن کو

غالب دہلی کے بازار گئے تھے۔ اسی دوران چند رہزن گھر میں داخل ہوئے اور سارے سامان لوٹ کر لے گئے۔ اس لوٹ کا غالبؔ پر اثر کیا ہوتا کہ اور الٹا رہزن کو دعائیں دے کر رات بھر گہری نیند سوئے ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

یہ جان کر کہ ان کا محبوب کسی اور سے بھی رسم و راہ رکھتا ہے غالب کی غیرت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس کا سر قلم کر دیں۔ یا خود ہی ڈھکنی بھر پانی میں ڈوب مریں۔ لیکن اس کے برعکس غالب

اس کی ہمت افزائی یہ کہہ کر فرمارہے ہیں ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

غالب کے بار بار گڑگڑانے اور محلہ والوں کی سفارش پر محبوب نے یہ کہلا بھیجا کہ وہ غالب کا امتحان لے کر دیکھے گا کہ یہ میاں کتنے پانی میں ہیں۔ اور عاشق صادق ہونے کا دعویٰ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔ غالب نے جواباً لکھ بھیجا۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

مشق سخن کے ساتھ غالب مصوری بھی سیکھتے تھے۔ اور بہت جلد اس فن میں ماہر ہو گئے لیکن کہاں شاعری اور کہاں مصوری لوگوں کی حیرت اور استفسار پر غالب نے صاف گوئی کو راہ دیکر فرمایا ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

شراب نوشی سے غالب کی غرض نشہ یا اس سے لطف اندوز ہونا قطعی نہ تھا مگر اعتراض کرنے والوں کو کوئی کیا کہئے۔ وہ تو رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ غالب نے واضح الفاظ میں اپنی مئے نوشی کی یوں وضاحت کردی تھی۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

معشوق سنگدل اور خوشامد پسند ہوتا ہی ہے لیکن خوشامد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ غالب نے خوشامد کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا پھر بھی انسان تھے تنگ آکر ایک دن غالب نے لکھ ہی مارا ؎

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

غالب کو ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا کہ جانے قاصد ان کا نامۂ شوق اُن کے محبوب تک پہنچاتا بھی ہے یا یوں ہی ڈینگیں مارتا ہے۔ جب قاصد کی طرف سے بدگمانی بہت بڑھی تو غالب نے اپنے سرالی رشتے کے ایک جنبر شخص کو پیغام رسانی کے لئے راضی کیا لیکن اس نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

غالب کا وہ معتبر قاصد پیغام زبانی لے کر چلا تو غالب بھی بھیس بدل کر ساتھ ہو لئے کہ دیکھیں اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ قاصد نے کوچۂ دلدار میں جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ ستم ایجاد تلوار لٹکائے حویلی سے باہر نکلا۔ اور غالب کا پیغام زبانی سنتے ہی طیش میں آ کر قریب تھا کہ قاصد کی گردن اپنے ہاتھ سے اڑا دے کہ غالب چلائے ہاں ہاں ہے

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے وہ میرا قصور تھا

اس طرح قاصد غریب کی جان تو بچ گئی لیکن اس ستمگر کے اشارے پر رقیبوں نے غالب کو دھر دبوچا۔ وہ تو کہئے کہ حیات کی دوڑی مضبوط تھی کہ بطور سزا صرف بے آبرو ہو کر کوچۂ جاناں سے نکالے گئے اور وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے نکلے ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہر چند کہ غالب کا محبوب بیگانۂ وفا تھا۔ اُن کی جاں نثاری اور وفاؤں کی داد نہ دیتا تھا۔ پھر بھی غالب کی سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ محبوب کی اس حرکت کو اس کے غرور حسن سے تعبیر کرتے ہیں ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند ان کے پاس دلِ حق شناس ہے

غالب کے محبوب کو اگر کبھی اپنی فینس میں سوار غالب کے کوچہ گزرتے کا اتفاق ہوتا تو کہاروں کو بھاگم بھاگ گزر جانے کی ہدایت کی جاتی ۔ بلکہ عجلت کی انتہا یہ ہوتی کہ کہاروں کو کندھا بھی بدلنے نہ دیتا ۔ غالب کو اس کا بہت احساس ہوتا اور وہ شکایت کرتے پھرتے ۔

فینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

غالب کے کلام پر نکتہ چینیاں ہوا کرتی تھیں ۔ لوگ اعلانیہ کہتے کہ غالب کا کلام مہمل اور بے معنی ہوتا ہے ۔ کچھ روز تک غالب خاموش رہے لیکن جب نکتہ چینیاں حد سے بڑھیں تو غالب نے ایک بڑا سا پوسٹر چھپوا کر بیچ چوراہے پر آویزاں کرا دیا لکھا تھا ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا !
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک دن غالب کوچۂ محبوب میں سرگشتی کر رہے تھے کہ ان کا محبوب مارکٹنگ کے لئے باہر نکلا ۔ ترنگ میں آکر حضرت غالب پیش دستی کر بیٹھے ۔ ان کے محبوب نے بھی دھول دھپّہ سے کام لیا ۔ لیکن غالب اس سراپا ناز کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے وہ کہتے ہیں ۔

دھول دھپّہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

غالب اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن مے نوشی کی عادت میں کوئی فرق نہ آیا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ہر شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ اب غالب کے ہاتھوں میں جنبش تک نہیں ۔ بس یہی تھوڑا آنکھوں میں دم ہے ۔ بہتر ہوتا کہ ساغر و مینا ان کے سامنے سے ہٹا کر توبہ استغفار کی تلقین کی جائے ۔ یہ سن کر غالب نے تیمار داروں سے التجا کی ۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اب ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کب غالب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔ ہر وقت غنودگی طاری رہتی۔ انھیں کچھ ہوش میں دیکھ کر کسی نے جھک کر پوچھا۔ اگر کوئی آخری خواہش ہو تو کہا جائے۔ غالبؔ نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں یہ وصیت کی کہ میری نعش کو محبوب کی گلیوں میں کھینچے پھرنا ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار ہوں

عالمِ نزع کا وقت جب طویل سے طویل تر ہونے لگا تو تیمارداروں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہو نہ ہو محبوب کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا میں دم اٹکا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی ایک تیماردار نے غالبؔ کے محبوب کے در دولت پر حاضر ہو کر صورتِ حال عرض کی اس وقت وہ بن سنور کر کہیں جانے کو تیار تھا۔ بارے غالبؔ کا احوال سن کر اس کا دل پسیجا اور وہ اپنا پروگرام کینسل کر کے غالب کے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا۔ محبوب کے رُخِ زیبا پر نظر پڑی تو غالبؔ نے سرد آہ کھینچ کر فرمایا ؎

منہ کیوں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

غالب کی رُوح واقعی اس توبہ شکن کی آخری دیدار کے لئے اٹکی ہوئی تھی دلی مراد بر آئی تو غالبؔ کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ لوگوں نے کان لگایا تو یہ صاف سنائی دیا۔ غالب کہہ رہے تھے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا
وادریغا وہ رندِ شاہد باز

٥

چچا ہیر کٹنگ سیلون میں

اللہ کا شکر ہے مرزا صاحب کہ دیر سہی لیکن آتو گئے"۔ ہنگن مرزا کو دیکھتے ہی چچا بولے "۔ مگر دوست جیسے جیسے آتے ہیں دیر ہو رہی تھی میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ دیکھو نا چائے ابھی تک پڑی ہے۔

"کوئی مضائقہ نہیں"۔ ہنگن مرزا شیروانی کا بٹن کھولتے ہوئے بولے "۔ ہوا یہ پیر صاحب کہ مجھے حجام کا انتظار تھا۔ شیو تو خود ہی کر لیتا ہوں۔ صرف بال کٹوانے کے لئے ہر دو ماہ پر ایک آفت مول لینی پڑتی ہے (چچا کے گھٹے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیر کر) تم ہی اچھے ہو یار کہ استرہ پھیروا کر چٹیل میدان کرا لیتے ہو۔۔۔۔۔ ہاں تو جب حجام کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو سوچا کہ بیکار ہی جان دے جا رہا ہوں۔ پیسے ہی خرچ کرنے ہیں تو تو خوشامد کیسی۔ اور جا پہنچا ہیر کٹنگ سیلون"۔

"یہ کیوں مرزا"۔ چچا نے پوچھا "۔ سیلون کیا ہوتا ہے"۔

"توبہ!"۔ ہنگن مرزا بولے "۔ مشکل تو یہ ہے کہ معمولی انگریزی بھی تم نہیں سمجھ سکتے۔ اجی میاں، ہیر کٹنگ سیلون کہتے ہیں اس جگہ کو جہاں نہایت ہی اہتمام سے بال کاٹے جاتے ہیں۔

"اچھا اب سمجھا"۔ چچا بولے "۔ تو پھر کیا ہوا مرزا!"

"ہوا کیا"۔ ہنگن مرزا بولے "۔ ٹھاٹ سے بجلی کے پنکھے کے نیچے گردش کرنے والی کرسی پر بیٹھ کر حجامت بنوائی اور وہیں سے سیدھے چلا آرہا ہوں، ویسے ہیر کٹنگ سیلون کا نام بہت دنوں سے سنتا آرہا تھا لیکن دیکھنے کا اتفاق آج ہی ہوا"۔

پہ چچا حجام کا انتظار کر رہے تھے۔ جب اُس کے آنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو چچا کو سیلون والی بات یاد آگئی۔ لپکتے ہوئے حویلی میں آئے اور چچی سے بولے "ذرا دروازہ بند کر لیجیو۔ یہی تھوڑی دیر میں آتا ہوں"۔

"مگر اس وقت تو کہیں جاتے نہ تھے"۔ چچی بولیں "آخر چلے کہاں"۔ "میں بھی تو سنوں"۔

"بھئی"۔ چچا بولے۔ "میں ابھی جہاں جا رہا ہوں اس جگہ کا نام کچھ ایسا ٹیڑھا میڑھا ہے کہ تمہاری زبان ہی پر نہ چڑھے گا۔ اور اگر زبان پر چڑھ بھی گیا تو اس کا مطلب سمجھاتے سمجھاتے میرا دیوالہ نکل جائے گا۔ لیکن میں لوٹ کر آیا نہیں کہ تم خود ہی سمجھ جاؤ گی کہ میں کہاں گیا تھا"۔

پہ چچا ہیر کٹنگ سیلون پہنچے اور ایک کرسی پر اپنا چھاتا رکھ کر خود بھی اس پر بیٹھ گئے کسی نے کہا "یہ چھتری تو کنارے لگا دیجئے۔ بہا گی تھوڑی ہی جاتی ہے"۔ لیکن چچا نے سنی ان سنی کر کے ایک طالب علم سے جو بال بنوا کر چلنے کو تھا پوچھا "ابی جی بابو۔ تم بال کوٹا کر جا رہے ہو یا یوں ہی چلے"۔

"نہیں تو" اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے بال نہیں بنوائے دیکھئے میرے سر پر آدھے بال بھی نہیں رہے"۔

پہ چچا ہنسے "میاں یہ کسی اور کو بیوقوف بنانا۔ ذرا اپنے سر پر ہاتھ تو پھیرو۔ ٹوکریوں بال پڑے ہیں۔ اس پر بھی کہتے ہو کہ بال کٹوائے ہیں۔ اچھا مذاق ہے"۔

"حجام نے آواز دی "آئیے مولوی صاحب۔ کیا بنوانا ہے۔ آپ کو۔ ؟"

پہ چچا چھاتا لیے ہوئے اٹھے اور حجام سے بولے "بھئی گھومنے والی کرسی کون سی ہے۔ میں اسی پر بیٹھوں گا"۔

"یہ گھومنے والی ہی کرسی ہے حضور"۔ حجام نے جواب دیا۔ پہ چچا مع چھاتا کرسی پر بیٹھ گئے تو حجام نے یہ دکھلانے کو کہ یہ گردش کرنے والی ہی کرسی ہے پہ چچا کو ایک چکر دے دیا۔ پہ چچا پھڑک اٹھے "واللہ، جیسا ننگین مرزا نے کہا تھا اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر پایا۔ لطف آگیا خدا کی قسم (حجام سے) ..... دو تین چکر اور رہے یار"۔

"تو آپ شیو کرائیں گے کیا مولوی صاحب" حجّام نے پوچھا "دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے سر پر گویا بال ہے ہی نہیں"

"اچھا" ! چچا نے حجّام کو گھورا "ان اسکولئے لڑکوں کی طرح بال رکھ کر آؤں تب تمہیں دکھائی دیں گے۔ توبہ ! دیکھتے نہیں۔ بال اتروائے دو ہفتہ سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں

"تو آپ سر گھٹوانے آئے ہیں یہاں ؟ حجام نے نفرت کا لہجہ اختیار کیا۔

اور نہیں تو کیا۔ تمہارا متھ دیکھنے آیا ہوں۔ چچا نے خود ہی کرسی کو چکر دیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو جب آپ کو سر منڈوانا ہے تو چلے جایئے فٹ پاتھ پر" حجام نے چچا کے کندھے پر سے چادر کھینچتے ہوئے کہا۔

"آخر تم حجام ہو کہ نہیں" چچا نے غصے کا اظہار کیا۔

"حجام ہوں کیوں نہیں" اُس نے جواب دیا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی گدھا لے آئے کہ اس کے بال مونڈ دو۔ تب تو یہ ایم۔ اے اور بی اے میں پڑھنے والے بابو آچکے میرے یہاں ۔۔۔۔ اچھا آپ آئے ہیں سیلون کو بدنام کرنے"

وہ تو اڑ بیٹھا تھا کہ سر نہیں مونڈ سکتا۔ لیکن سیلون میں موجود کالج کے لڑکوں نے حجام کو سمجھایا کہ اس میں بگڑ تا ہی کیا ہے۔ رہنے ایک ہاتھ

حجام نے استرا پھیر کر چچا کی چکنی کھوپڑی پر پاوڈر چھڑک دیا۔ چچا نے جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو آگ بگولہ ہو کر بولے۔ یہ تم نے میرے سر پر سنگ جراحت کیوں چھڑک دیا۔ مجھے سخت نفرت ہے اس سے"

"اجی حضور" حجام نے کہا "یہ سنگ جراحت نہیں۔ پوڈر ہے۔ بہت ہی قیمتی پوڈر"

"ہوگا قیمتی پوڈر تمہارے لئے" چچا منھ بسور کر بولے "میں تو اسے راکھ سمجھتا ہوں راکھ (کچھ دیر سر سہلا کر) تمہارے پاس لال مٹی ہے کہ بس"

"ہے کیوں نہیں" حجام بولا "مگر کیا کرنا ہے اس کا"

چچا جھنجھلائے "پتہ نہیں کیسے سیلون چلاتے ہو۔ اماں جلدی سے لال مٹی بھیگو کر میرے سر میں لگا دو۔ اُف اف کس قدر لہر رہا ہے میرا سر ضرور تم نے کہیں کاٹ چھانٹ کیا ہے"

حجام نے لال مٹی بھگو کر چچا کے سر پر لیپ دی۔ چچا پنکھے کے نیچے بیٹھے ہی تھے لال مٹی سر میں لگنے کے بعد اوپر سے ہوا جو لگی تو چچا نے فرحت بخش ٹھنڈک محسوس کی۔ کرسی پر اکڑے ہوئے حجام سے بولے "بھئی، اس گردش کرنے والی کرسی کا ہے دو تین چکر اور۔۔۔۔۔ اس عرصہ میں چچا نے گالوں پہ ہاتھ پھیرا تو کھونٹی نمودار تھی۔ بولے "لگے ہاتھ شیو بھی کر ہی ڈالو"

چچا کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ اس لئے حجام نے چچا سے کہا۔ میرے ہاتھ میں اوزار ہے ذرا اطمینان سے بیٹھے گا حضور"

"تو کیا میں اُچھل کود کر رہا ہوں" چچا بولے "عجیب طرح کے آدمی ہو تم بھی جیسے میں احمق ہوں۔ چلو اپنا کام کرو"

حجام نے چچا کے گال پہ استرہ رکھا ہی تھا کہ کسی کے سوال کا جواب دینے کے لئے چچا نے جھٹکے سے میری طرف منہ گھمایا اور وہ بھی اس تیزی سے کہ حجام استرہ سنبھال نہ سکا۔ اور چچا کا پورا کان کٹ کر لٹک گیا۔ چچا ہائے ہائے کرنے لگے۔ اس وقت کالج کے انہیں لڑکوں نے چچا کے کان کو سانٹ کر پٹی باندھ دی۔ گھٹے ہوئے سر میں لال مٹی پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ اس پر سے پٹی جو بندھی تو نہایت ڈراونی شکل ہو گئی۔

چچا کا کان کٹ جانے سے حجام اتنا ڈر گیا کہ معذرت کرتا ہوا چچا کو رکشہ پر لاد کر گھر پہنچا گیا۔ چچا کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر چچی بولیں۔ "ٹھیک ہی کہا تھا آپ نے بنو کے ابا کہ میرے واپس آتے ہی تم خود سمجھ جاؤ گی۔ تو اب بتلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی صورت ہی دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی ہوں"

— ٭ —

جوشش عظیم آبادی اور اُن کا منظورِ نظر

اُن کے اشعار کے آئینہ میں

کہتے ہیں کہ جوشش عظیم آبادی کو عالم پیری میں عشق کا سودا سر میں سمایا اور لطف یہ کہ دل بھی آیا تو ایسے خرد سال خوبرو پر جس کے شباب کی ابھی ابتدا ہوئی، بھلا پیری کے عشق میں خاک لذت ہوتی حضرت جوشش فرماتے ہیں ؎

لذت ہو خاک عشق کی پیری میں ہم دماں
معشوق خرد سال ہے عہدِ شباب ہے

ایام پیری میں دم خم ہی کتنا رہتا ہے اس پر طرہ یہ کہ مرض عشق لاحق ہو جائے۔ جب عشق کا یہ آغاز ہو تو انجام کا خدا حافظ ؎

ہوتے ہی عاشق گئے تاب و تواں صبر و قرار
دیکھئے انجام کیا ہو جس کا یہ آغاز ہے

پہلے تو جوشش یہ کہتے رہے کہ وہ ایسے کے دام محبت میں گرفتار ہیں جس کی زلفوں میں پھنسا چھوٹتے نہ دیکھا گیا۔ ؎

جس کی زلفوں میں پھنسا چھوٹتے دیکھا نہ کبھی
اس کے ہی دام محبت میں گرفتار ہیں ہم

آگے چل کر یہ بات واضح ہوئی کہ جوشش عظیم آبادی کا معشوق صنف نازک نہیں بلکہ صنف کرخت تھا۔ اس کی تصدیق جناب جوشش عظیم آبادی ہی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

جتنا ہم چاہتے ہیں چاہتے ہیں سنتے ہو
خواہ تم دور رہو۔ خواہ رہو میاں نزدیک

جوشش اپنے جس منظور نظر کو میاں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں وہ دراصل ایک ترک پسر تھا جس کی الفت میں وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر بیٹھے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

نذر کیا کیجئے وہ ترک اگر آجائے
دل نہیں۔ جان نہیں۔ دین اور ایمان نہیں

اس ترک پسر کی کس ادائے خاص پر جوشش کا دل آیا تھا یہ کہنا مشکل ہے ممکن ہے اُن کا دل اس کے زلف کا شیدائی ہو۔ جس کے متعلق جوشش کا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی برہمن اُس کے زلف کو دیکھ لے تو اُسے اپنے گلے کا زنار فراموش ہو جائے ؎

اے ترک تیری زلف کو دیکھے جو برہمن
ہو اپنے گلے کا اُسے زنّار فراموش

اس ترک پسر کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ سبزہ کا آغاز تھا جس سے اُس کے حسن خدا داد میں چار چاند لگ گئے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس نے اپنے سبز خط پر سیفٹی ریزر پھیر دیا۔ اس کی اس حرکت پر جوشش محبت آمیز خفگی کا اظہار کرتے ہیں ؎

اس سبزۂ خط کو کیوں منڈایا
ہے تجھ سے یہی غبار مجھ کو

جوشش عظیم آبادی کا منظور نظر پیشے کے اعتبار سے رقّاص تھا۔ جوشش نے جس دن سے اس کو رقص کرتے دیکھا تھا تب سے ان کو سوائے رقص کے اور کچھ بھاتا ہی نہ تھا۔

جب سے نظر پڑا ہے وہ رقّاص دلفریب
بھاتا نہیں ہے مجھ کو یہاں کچھ سوائے رقص

کہتے ہیں کہ اس کے زلفوں کی درازی کا یہ عالم تھا کہ وہ شام سے اُسے باندھنے

بیٹھے تو بلا مبالغہ صبح ہو جائے ؎

درازی اُس کے زلفوں کی بیاں کیا کیجئے جوشش

جو باندھی جائے گر وہ شام سے تا سحر باندھے

جناب شیخ نے دوستی اور قریب مکانی کے ناتے ملامت کی کہ کیا اس عمر میں کسی ترک پسر کے عشق میں مبتلا ہو کر آہ و نالے کرتے ہو لعنت بھیجو اس چھوکرے پر۔ جناب جوشش نے تنک کر جواب دیا ؎

اے شیخ تو جو دیکھتا اُس آفت جان کو

نت مانگتے ہی تجھ کو مناجات گزرتی

کوئی معشوق یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک پیر فرتوت دام محبت میں مبتلا ہو کر اس کے کوچہ کی خاک چھانے۔ اس ترک پسر نے پہلے تو جناب جوشش کی تنبیہ کی اس پر بھی جب وہ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو گالیاں دینے پر اتر آیا۔ لیکن محبت کے جوش میں جوشش اس کی حرکت برداشت کرتے رہے۔ کوئی دوسرا ان کی جگہ ہوتا کبھی درگزر نہ کرتا۔ جوشش عظیم آبادی کو خود بھی اس کا اعتراف ہے ؎

جو کوئی اور ہماری جگہ ہو جوشش

تو اس کی گالیاں سن سن کے درگزر نہ کرے

جوشش نے اس منظور نظر چھوکرے کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ لیکن جب اس نے ان کی پُر خلوص دعوت ٹھکرا دی تو جوشش نے اس آرزو ہی کو اپنے دل سے نکال دیا ؎

میاں تم میرے گھر آؤ نہ آؤ

اُٹھایا میں نے دل اس آرزو سے

جب کبھی اس ترک پسر کی ایک جھلک دیکھنے کی نیت سے جوشش عظیم آبادی اس کے کوچہ میں جاتے تو وہ خوبرو چھوکرا انھیں دیکھ کر اس انداز سے مسکراتا جس سے صاف دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے ؎

مسکراتا ہے مجھے دیکھ کے غیروں کے حضور
یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا

جوشش کا منظور نظر چھوکرا اپنے حسن وجمال پر نازاں اپنی ستور کر نکلتا تو کسی کی جانب نگاہ نہ کرتا۔ جوشش کی طرف تو مطلق توجہ نہ دیتا۔ اس کی بے رخی کو جوشش اس کے غرور حسن سے تعبیر کرتے ہے

دیکھتا ہی نہیں کسی کی طرف
کیا غرور اس کو ہے جوانی کا

جناب شیخ اپنا فرض ادا کر ہی چکے تھے۔ حضرت ناصح نے بھی جوشش کو عشق و عاشقی کے انجام سے ڈرایا تو جوشش نے جواب دیا ہے

ناصحا عشق سے کیوں اتنا ڈراتا ہے مجھے
میں ڈرانے سے تمہارے کوئی ڈر جاؤں گا

ایک دن اس ترک پسر کی رگ حمیت جو پھڑکی تو تلوار کمر سے لٹکائے جوشش کے قتل کے ارادے سے آدھمکا لیکن جوشش کی بے بسی پر ترس کھا کر ہاتھ روکے رہا ہے

قتل کو آیا پر میری بے بسی
دیکھ کر وہ ترک پھر رہ گیا

اس ترک پسر چھوکرے کو یک دم کھڑا دیکھ کر جوشش نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے للکارا ہے

دیکھتا کیا ہے کھڑا کھینچ کمر سے تلوار
لائی ہے سامنے تیرے مجھے تقدیر بہ زور

وہ چھوکرا جوشش کے قتل کا ارادہ ملتوی کر چکا تھا۔ تلوار نیام میں ڈالے واپس جانے کو پلٹا تو جوشش نے راستہ روک کر کہا ہے

تمہاری صورت کو دیکھتے ہی میاں یہ حالت ہوئی ہماری
دل و جگر سے اٹھے ہیں شعلے ہوئے ہیں آنکھوں سے اشک جاری

لیکن جب منت و سماجت کے بعد بھی وہ کمبخت اپنے فیصلہ پر اٹل رہا تو جوشش اپنی عشق بازی پر دل ہی دل میں پچھتائے اور پھر خود ہی دل کو تسلی دینے لگے ؎

دے کے دل پچھتانے سے ہوتا ہے کیا
ہونی تھی سو ہو چکی رونا ہے کیا

کسی سے محبت کر کے ترک محبت آسان نہیں۔ وہ بھی بڑھاپے کا عشق۔ اب جناب جوشش عظیم آبادی نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ دل مضطر کو بہلانے کی خاطر اگر دو گھڑی روتے تو دو گھڑی اشعار پڑھ کر گزارتے ؎

دو گھڑی روتا ہوں اور دو گھڑی پڑھتا ہوں شعر
اس دل ناشاد کو اس طرح بہلاتا ہوں میں



پھپھی کی زبانی

"یہ ٹھیک ہی کرتے ہو بیٹا" پھپھی بولیں۔" جو تم اپنے چچا کے کرتوت اخباروں میں چھپوا دیتے ہو۔ اس پر بھی ان کی حرکت چھوٹے تب تو..... مگر اے بابو، تم تو وہی کچھ لکھتے ہو جو اپنے چچا کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہو۔ لیکن تم کو کیا خبر اُن کے پہلے کے کرتوتوں کی۔"

"پھپھی" میں نے کہا "جب سے ہوش سنبھالا ہے چچا کا یہی رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں اور اسی لئے کئی مرتبہ آپ سے کہا بھی کہ چچا کی جوانی کے کچھ حالات سنائیے۔ مگر آپ برابر آج کل کرتی رہیں۔

ہاں بیٹا" پھپھی ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولیں۔ "جب طبیعت ہی ٹھیک نہ رہے تو کوئی کیا کرے مگر آج تھوڑا بہت ضرور سناؤں گی..... (بدھوا کو آواز دے کر)..... ذرا ہنڈیا چولہا اتار رہیو میں یہیں اُسارے میں بیٹھی ہوں

"تو سنو" پھپھی بولیں "میں لگ بھگ چودہ برس کی تھی کہ تمہارے چچا سے میری شادی کی بات چلی..... اے بابو! اس دن سے تمہارے چچا نے میرے محلے کی خاک اڑا دی۔ صرف ایک نظر مجھے دیکھنے کو ان کی اس حرکت سے تنگ آکر میں نے کوٹھے پر چڑھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ ان کے چھکے چھڑا کر ہی دم لوں گی۔ تو میں نے اپنی ایک سہیلی کو سکھا پڑھا کر تیار کیا وہ نگوڑی کھولتا ہوا پانی پچکاری میں بھر کر کوٹھے پر چڑھ گئی۔ جب تمہارے چچا گردن اٹھائے جھانکتے تاکتے اِدھر سے گزرنے لگے تو میری سہیلی نے تاک کر ایسی پچکاری چلائی کہ یہ میاں جی چھلملاتے ہوئے بھاگے تو پھر ناتی مرے

کہ ادھر کا رخ کریں۔

تمہارے چچا کی بد مزاجی کا بہت چرچا تھا۔ میں بے زبان کچھ کہتی تو کس سے گھٹ گھٹ کر رہی۔ یہاں تک کہ تمہارے چچا بارات لے کر پہنچے۔ اپنے خاندانی رواج کے مطابق کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے تھے۔ منڈوا میں بیٹھا کر رسم ہو رہا تھا کہ ٹھیک اسی وقت گھر کی پلی ہوئی بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ تمہارے چچا کو نہ جانے کیا سوجھی کہ نیام سے تلوار نکال کر انھوں نے ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ بلی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور یہ میاں ہیں کہ منڈوا میں اکڑ رہے ہیں۔ اور یہ جو ابھی تک اکڑتے ہوئے دیکھتے ہو تو یہ ان کی پرانی عادت ہے"۔

"اب سنو بابو"۔ چچی بولیں۔" دسہرا کھانے کو دس روز تمہارے چچا حویلی میں کیا رہے کہ ناک میں دم کر دیا اماں بے چاری کا۔ ہر دم ہے کہ یہ چیز ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چیز ٹھیک نہیں ہے۔ اور اے بابو، دیدے کا پانی ایسا ڈھلا ہوا کہ کہاں تو گھر کے اندر مہمان عورتیں بھری ہیں اور کہاں یہ ہیں کہ کوٹھری کوٹھری پھُدکے پھر رہے ہیں"۔ اماں جان سے نہ رہا گیا تو دالان سے بولیں"۔ بیٹا اندر آنے کے قبل ذرا کھکھار تو لیا کرو .... اے بابو! اس وقت پچھم طرف میرا منھ ہے، اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ تھوتھنا پہلے سے اور زیادہ لٹک گیا۔ کھانے کے لئے دسترخوان بچھا تو پیٹ میں درد کا بہانا کر کے پڑ گئے۔ ابا جان کو خبر ملی تو گرتے پڑتے پہنچے کئی ڈاکٹر بھی آ گئے۔ مولوی صاحب نے تعویذ باندھی اور پانی پڑھ کر پلایا گیا۔ لیکن کوئی بیماری ہوتی تب تو۔

صبح ہوتے ہی بغیر کسی سے کچھ کہے سنے تمہارے چچا چوراہے پر سے ڈولی لے آئے اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے ننگی تلوار لئے آنگن میں ٹہلتے رہے۔ کس کی مجال تھی۔ بھلا جو زبان ہلا لیتا۔ ابا جان بھی اپنی بیٹھک سے باہر نہ نکلے اور میں نگوڑی کا روتی کلپتی ڈولی سوار ہو گئی"۔

تمہارے چچا کو بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی اور طوطی پالنے کا شوق بہت پہلے سے تھا۔ شطرنج بھی کھیلتے تھے۔ بعد میں ان جھاڑو مارے بھنگن، کمن اور چھٹن نے

نے افیم کھانے کی چاٹ لگادی ۔

" ذرا یہ تو بتایئے چچی " میں نے پوچھا " کیا چچا شروع ہی سے سر گھٹاتے چلے آرہے ہیں یا سن آنے کے بعد "

اچھا ٹھہرو ۔ چچی بولیں " اس کے بارے میں بھی بتاتی ہوں ۔ ذرا دیکھ لوں کہ ہنڈیا تو نہیں جل رہی ہے ۔ یہ نگوڑا ادھوا افیم تو نہیں کھاتا مگر اونگھتا ہے اپنے مالک ہی کی طرح "

" چچی کھٹولے پر بیٹھ کر پنکھا ڈلاتے ہوئے بولیں " بٹیا ۔ تم نے اپنے چچا کو جوانی میں نہیں دیکھا ۔ بڑے اچھے کسرتی اور خوب گٹھے گٹھے بازو تھے ان کے ۔ لم دھڑنگ جیسے ہیں وہ تم دیکھ ہی رہے ہو ۔ اس پر سونے پر سہاگہ لمبے لمبے بال تھے جو ہر وقت کنگھی سے سنوارے جاتے آنکھوں میں سرمہ کی سلائی ضرور پھیرتے ۔ اور پہناوا شروع سے ایک طرح کا ہے .... یہی نام لو سلیم شاہی جوتا ۔ چوڑی دار پاجامہ اور دو پلی ٹوپی ۔ گھر سے نکلتے تو بدن پر انگا اور ہاتھ میں مرزاپوری ڈنڈا .... اے بٹیا ، ان کو اللہ نے ایسے خوبصورت بال دیئے تھے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے ۔ لیکن ان اٹھائی گیرے دوستوں کی صحبت میں ستیاناس ہو گیا ان کا "

یہ کیسے چچی " میں نے پوچھا ۔

" کیسے کیا " چچی بولیں " انھیں گردن ماروں نے تمہارے چچا کو مرید ہونے کا مشورہ دیا ۔ پیر بھی ایسا ملا کہ نام ہی سن کر نفرت ہو یعنی شاہ کھساری ۔ تو اسی نے مرید کرنے کے قبل ان کے چاروں ابروؤں کا صفایا کرا دیا اور یہ تاکید کر دی کہ سر ہمیشہ گھٹا رہے تب ہی سے شکل ایسی ہو گئی ہے یا لوکہ جی بھر کر صورت دیکھی نہیں جاتی .... جب شاہ کھساری کا ذکر آ ہی گیا تو اس کی حرکت کے بارے میں بھی سن ہی لو ۔ ہوا یہ ہے کہ تمہارے چچا اسی شاہ کھساری نگوڑے کو بیٹھک میں اکیلا چھوڑ کر افیون لاتے بازار گئے ۔ میں باورچی خانہ میں تھی ۔ دروازے کی طرف نظر اٹھی تو دیکھا کہ شاہ کھساری پردے سے منہ نکالے اندر جھانک رہے ہیں ۔ میں نے جلدی سے لوہے کی ایک

سیخ چولھے میں ڈال دی۔ جب سیخ خوب گرم ہوگئی تو دبے پاؤں آکر شاہ کھاری کا کلّہ داغ دیا .... اے بیٹا وہ پیر نگوڑا چنگھاڑ مار کر جو بھاگا ہے تو اُس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا!! .... "چچی یہیں تک کہنے پائی تھیں کہ "ارے ارے" کہتی ہوئی آنچل برابر کر کے کھڑی ہوگئیں۔ تب میں نے دیکھا کہ چچا لپکتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔



ہاشم عظیم آبادی سے انٹرویو

(یہ ایک فرضی انٹرویو ہے جس میں ہر سوال کا جواب انھیں کی شعری تخلیق، انداز بیاں اور زبان سے ماخوذ ہے ۔)

میں :- ہاشم صاحب کیا واقعی آپ کا کلام اور انداز بیاں دوسرے سخنوروں سے الگ ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ کہا کرتے ہیں ۔

ہاشم عظیم آبادی :- ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ ہاشم کا ہے انداز بیاں اور

میں :- سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب آپ کا کیا مشغلہ ہے : میرا مقصد کسی کاروبار سے ہے ۔

ہاشم عظیم آبادی :- اجرت پہ روز لکھتا ہوں عشاق کے خطوط
دلچسپ دل پذیر مرا کاروبار ہے

میں :- کیا وجہ ہے کہ زندگی کے دوڑ میں آپ کامیاب و کامراں نہیں رہے ۔

ہاشم عظیم آبادی :- زندگی میں کیسے رہتا کامیاب و کامراں
جب نہیں آئے خوشامد کے ذرا بھی ڈھب مجھے

میں :- اولاد کو لوگ پیری کا عصا کہتے ہیں۔ آپ کو اس سے کہاں تک اتفاق ہے

ہاشم عظیم آبادی :- ہم تو پتلی سی چھڑی بھی نہیں کہتے اس کو
لوگ اولاد کو پیری کا عصا کہتے ہیں

میں :- آپ برابر کلین شیو رہا کرتے تھے پھر اچانک داڑھی چھوڑ دی کوئی مصلحت ضرور ہو گی اس میں ۔

ہاشم عظیم آبادی :- مصلحت کا تھا تقاضہ جو بڑھالی داڑھی
عقد کی شرط ضروری تھی مسلمان ہونا

میں :- پھر داڑھی آپ نے سیفٹی ریزر کی بھینٹ کردی - ایسا کیوں - ؟

ہاشم عظیم آبادی :- کیوں نہ داڑھی اپنی کرتا جنبش ریزر کی بھینٹ
خندہ ظن اس شکل پر جب حلقۂ احباب تھا

میں :- ہاشم صاحب اب تو یہ دیکھتا ہوں کہ چار چار دن کے چھوکرے بھی فرہادیاں کرنے لگے ہیں - یہ ایسا کیوں ہونے لگا -

ہاشم عظیم آبادی :- ہونٹ کی شیشیاں کالج میں جب بٹنے لگیں
چار دن کے چھوکرے کرنے لگے فرہادیاں

میں :- اگر کسی کو کسی سے عشق ہو جائے تو اسے مہلک مرض میں مبتلا ہونا بھی کہہ سکتے ہیں اس مرض کا آخری علاج کیا ہے ہاشم صاحب

ہاشم عظیم آبادی جوتا ہی اس مرض کا ہے اک آخری علاج
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

میں :- بیباک لڑکیوں کو آپ قیامت کہتے ہیں اس طرح تو آپ کے سر پہ بھی قیامت آسکتی ہے

ہاشم عظیم آبادی :- بیباک لڑکیوں کو قیامت کہیں گے ہم
چاہے ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

میں :- سب پیشوں میں آسان پیشہ کون سا ہے

ہاشم عظیم آبادی :- آسان مگر سب سے وزارت کا ہے پیشہ یوں گو ملک میں پیشے ہیں بہت کام بہت سے ہیں

میں :- ہر شعبۂ زندگی میں عورتوں کو مردوں سے آگے بڑھتے دیکھ کر یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ عورت مرد کو پردے میں نہ بیٹھا دے آپ کا کیا خیال ہے

ہاشم عظیم آبادی - ترقی کر کے عورت مرد کو پردے میں بیٹھا دے
یہ گو پہلے تھا ناممکن مگر اب اس کا امکان ہے

میں :- اس گرانی کے دور میں بھی لوگ بچہ پیدا کرنے سے باز نہیں آتے آپ اس کی

موافقت میں کیا ہیں۔

ہاشم عظیم آبادی بچہ تو بچہ ایسی گرانی کے دور میں
چوہا بھی اپنے گھر میں نہ پیدا کرے کوئی

بیرے :- عشاق شاعر اور واعظ کے متعلق آپ اپنی کیا رائے رکھتے ہیں

ہاشم عظیم آبادی : عشاق دل فروش ہیں شاعر سخن فروش
واعظ خدا فروش ہے جنّت فروش ہے

بیرے :- اچھا شاعر آپ کسے کہتے ہیں۔

ہاشم عظیم آبادی :- شاعر وہی اچھا ہے گلا جس کا ہو اچھا
کیا اس میں برائی ہے اگر شعر بُرا ہے

بیرے :- خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں - اس لئے انسان کو دو کان
اور ایک زبان عطا کی ہے اس میں کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

ہاشم عظیم آبادی :- مقصد یہ ہے کہ زیادہ سنو اور بولو کم
تب ہی تو کان دو ہیں مگر اک زبان ہے

بیرے :- یہ آج کل کے کنوارے کس خیال میں رہتے ہیں

ہاشم عظیم آبادی :- سب کنوارے اسی خیال میں ہیں
دیکھیں ملتا ہے ہم کو مال کہاں

بیرے :- سکون اور چین کا ہر شخص متلاشی ہے۔ لیکن یہ کہیں میسّر نہیں۔ آپ
کے خیال میں ایسی سکون کی دنیا کہاں ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی فتنہ
و فساد نہ ہو۔

ہاشم عظیم آبادی :- بڑے سکون کی دنیا ہے چنڈو خانہ بھی
پینک میں سب ہیں کہیں فتنہ و فساد نہیں

بیرے :- اگر آپ چاند پر پہنچ جاتے تو کیا کرتے۔

ہاشم عظیم آبادی :- ہم اہلِ جنوں جا کے تو آتے نہیں واپس
یہ کیا کہ گئے چاند پہ اور پھر اتر آئے

میزبان :- اور آخر میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ہر کسی کے دل میں آپ کی اتنی قدر کیوں ہے۔

ہاشم عظیم آبادی :- جو بتیاں سیدھی کیا کرتا ہے سب کی رات دن
قدر ہاشم کی جبھی تو ہر کسی کے دل میں ہے



بیچاری ناک

ناک انسان کے جسم کا ایک اہم ترین حصہ ہے جسے اونچا رکھنے کیلئے کیا کیا جتن نہیں کئے جاتے۔ اور کیسی کیسی خون ریز لڑائیاں ناک کی خاطر نہیں لڑی جاتیں لیکن اتنی اہمیت کے باوجود ناک کی نگہداشت کی طرف سے انتہائی غفلت برتی جاتی ہے

موسم سرما کے آتے ہی جسم کے ایک ایک عضو کو ٹھنڈک سے بچانے کے لئے طرح طرح کے اہتمام کئے جاتے ہیں۔ پیر کے لئے پاتا وا۔ سینے کی حفاظت کے لئے بنیان اونی سویٹر. کوٹ۔ کان اور سر کے بچاؤ کے لئے کن چھپی ٹوپی۔ انگلیوں کے لئے دستانے اور گلے کیلئے مفلر۔ لیکن بے چاری ناک کے لئے دو انچ کا ایک غلاف سلوانے کی آج تک کسی ناک والے کو توفیق نہ ہوئی۔ اُسے ٹھنڈک اور برفانی ہوا کا مقابلہ کرنے کے لئے اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے ناک کا وجود ہی نہ ہو۔ حالانکہ ناک کا نعم البدل نہیں۔

ایک ہاتھ کٹ جائے تو دوسرے ہاتھ سے کام لے سکتے ہیں۔ ایک پیر سے محروم ہو جائیں تو بیساکھی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک آنکھ ہی جاتی رہے تو بینائی کے لئے دوسری آنکھ کافی ہے۔ لیکن اگر کسی حادثہ میں ناک کٹ جائے تو پھر تا حیات سوائے جھک مارنے کے کوئی چارہ نہیں۔ ناک نہ رہنے پر گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بازار و لڑکے آوازہ کسنے اور نکٹا کہہ کر پکارنے سے باز نہیں آسکتے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ نکٹا غریب کو عمر بھر کنوارہ ہی رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کوئی لڑکی

والا نکٹا داماد پسند نہیں کر سکتا۔ چاہے نکٹے کی طرف سے ایک دھیلے کی بھی مانگ نہ ہو۔ ہاں شادی کے بعد دولہا یا تو اپنی ناک گنوا بیٹھیں تو یہ اور بات ہے۔ اس صورت حال کے تحت سسرال والے نکٹا داماد گوارہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ناک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بغیر چھری اور چاقو کے بھی کٹ سکتی ہے وہ اس طرح کہ اگر کوئی جوان لڑکی اپنے بوائے فرنڈ کے ساتھ راہ فرار اختیار کرے تو کہنے والے کہیں گے کہ اس کے پورے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ حالانکہ ناک اپنی جگہ پر سلامت رہتی ہے۔ اس کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناک رہتے ہوئے اسے چھو کر دیکھنا پڑتا ہے کہ ناک واقعی ہے بھی یا نہیں۔

کوٹھے پہ شیخ آپ کے بیٹے کی دھاک ہے
چھو کر تو دیکھئے کہیں چہرے پہ ناک ہے



لولا میٹر

رشتے کی بات جب چلتی ہے تو لڑکی کی تعلیم، حسب ونسب اور شکل وصورت پہ ہی پورا زور دیا جاتا ہے۔ لڑکی زبان دراز تو نہیں اس جانب قطعی دھیان نہیں دیا جاتا۔ اور اگر دھیان دیا بھی جائے تو صحیح انکشاف حال ممکن نہیں۔ عموماً اس کا پتہ تب ہی چلتا ہے جب بہو رخصت ہو کر آجاتی ہے۔ اگر بہو لولا دراز نکلی تو گھر جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ ایسی شادی خانہ بربادی کی مصداق ہوتی ہے۔ اسی طرح کے بہت سارے واقعات میرے پیش نظر تھے۔ اور میں برابر یہ سوچا کرتا تھا کہ ایک ایسا اعلیٰ ایجاد کیا جائے جس کے ذریعہ ہونے والی بہو کے لولا درازی کی پیمائش شادی انجام پانے کے قبل ہو سکے۔ یہ دھن مجھ پر ایسی سوار ہوئی کہ ایک ایسا آلہ تیار کر ہی لیا جس کا نام تھرما میٹر کے وزن پر لولا میٹر رکھا یہ ریموٹ کنٹرول قسم کا آلہ تھا۔ اسے ہونے والی بہو کے مکان کے کسی حصہ میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ یہ آلہ لڑکی کے لولا درازی کا پورا ریکارڈ اپنے اندر محفوظ کر لیتا۔ میری اس ایجاد سے لڑکے والے خوب مستفید ہو رہے تھے۔ اس کے برعکس لڑکی والوں میں ہاہا کار مچی تھی۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ رشتے کی بات چلتے چلتے اچانک ختم کیوں ہو جاتی ہے خصوصاً اس الزام کے ساتھ کہ اور سب تو ٹھیک ہے لیکن لڑکی بڑی لولا دراز ہے۔

میں بہت خوش تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اللہ نے آمدنی کا ایک معقول ذریعہ نکال دیا ہے۔ یہ لڑکی والوں کو رازداری کی قسمیں کھلا کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح حسب معمول ایک مولانا رازداری کے فارم کی خانہ پُری کر کے لولا میٹر خرید کر لے گئے۔ اور

رات کی تاریکی میں بڑے احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ہونے والی بہو کے مکان کے پچھوارے لولامیٹر فٹ کر ہی رہے تھے کہ کسی کی نظر پڑ گئی اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ دو چار ہی پہلوانی ہاتھ کے بعد گھبرا کر مولانا نے میرا نام بتانے کے علاوہ لولامیٹر کے کارناموں اور اس کے کارخانہ کی بھی نشان دہی کردی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی کہ وہ سارے لڑکی والے جو میری اس ایجاد کے زد میں آنے تھے۔ لاٹھی، تلوار اور بلم برچھالے کر ٹوٹ پڑے۔ اور سارے تیار شدہ لولہ میٹر کو تہس نہس کر کے مجھے بھی کیفر کردار تک پہنچانا چاہا لیکن خوش قسمتی سے میں اس وقت گھر پر نہ تھا۔ گھنٹوں نعرہ بازی کرتے، دشنام کے میٹھے گردانتے اور ہوا میں بلم برچھا لہراتے اپنے گھروں کو سدھارے۔

حملہ آوروں کی توڑ پھوڑ کے بعد ایک لولامیٹر جو کسی طرح محفوظ رہ گیا تھا اسے میں نے اپنے صاحبزادے کے حوالہ اس تاکید کے ساتھ کر دیا ہے کہ وقت آنے پر جب تمہیں بھی بہو لانا ہو تو اس لولامیٹر سے بہو کی زبان داری کی پیمائش کے بعد ہی لانا۔



امتحان کا نتیجہ

مجھے بھی اپنی کامیابی کا یقین ہو ہی گیا۔ اور نہ ہوتا کیوں؟ بھلا میں کھلاڑی یا بدشوق تھوڑا ہی تھا۔ صرف یہی نا کہ طبع آزمائی کا شوق۔ مگر یہ تو کوئی ایسی بات ہی نہ تھی کہ میں ناکامیابی کا منحوس اور بھیانک خواب دیکھتا۔ میرے اعزا اور احباب پر تو میری دھاک ہی جمی تھی۔ بھلا کس کی مجال کہ میری شان میں لفظ ناکامیابی نکال لے بلکہ بقول میر صاحب اس کی زبان ہی کھینچ لی جاتی۔

میر صاحب مرحوم خدا غریق رحمت کرتے تھے تو میرے یہاں صرف کھانے پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حق نمک ادا کر دیا۔ میری ذہانت و فہم کے قائل تھے اور میری تعریف میں ایسے رطب اللسان تھے کہ میرا دماغ ہی نہ ملتا۔ اور اگر سچ پوچھئے تو یہ میر صاحب قبلہ ہی کی عنایت تھی کہ مجھے اپنی کامیابی میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نظر نہ آتی تھی۔

عین نتیجہ کے روز میر صاحب مرحوم میرے چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے قسمیں کھا کھا کر میری کامیابی کا یقین دلا رہے تھے، بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گئے کہ اگر ہاشم امتحان میں اول نہ آیا تو مجھے کچھ کہہ کر پکار لینا۔ اور میں بھی انہیں کے درمیان بیٹھا بھیگی بلّی کی طرح دم توڑ رہا تھا اتنے میں ایک صدائے لرزاں "میٹرک کا رزلٹ" نے مجھے دہلا دیا۔ میرا سر زور زور سے چکرانے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے قلب کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں اٹھنے سے قطعی مجبور تھا۔ صرف مری مری ہوئی نگاہوں سے دوستوں کی طرف تکتا

رہا۔ میر صاحب مرحوم خدا جوار رحمت میں رکھے اخبار پر ایسا چھپے کہ وہ قلفی جس میں افیون گھول چکے تھے۔ چاندنی کی نذر ہو گئی۔ لیکن اس پر بھی وہ اپنی پوری طاقت سے پلے پڑ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا، پیٹ نمبر ۱۵۵ ار کا کہیں پتہ نہیں،، یہ آواز نہ تھی میرے لئے موت کا پیغام میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ مجھ پر نزع کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور میرا دم گھٹنے لگا میری شہرتیں خاک میں مل چکی تھیں۔ اور میر صاحب پیش گویاں بھی۔ میں اٹھا اور خود کو بدقت تمام گھسیٹتا ہوا پلنگ پر گرا دیا۔ اور طرح طرح کے خیالات میں غوطے کھانے لگا۔ میں اپنے کو اس وقت اس بادشاہ کی طرح سمجھ رہا تھا جس کی سلطنت چھن گئی ہو میں نے سوچا تف ہے۔ ایسی زندگی پر اس سے تو موت کہیں بہتر ہے۔ کیوں نہ جا کر گنگا کی آغوش میں ابدی نیند سو رہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں میں نے اس ترکیب کو نظر انداز کر دیا۔ پھر سوچا کیوں نہیں زہر ہلاہل کھا کر خود کو اس رسوائی کے بھنور سے پار اتار دوں۔ مگر مجھے یہ صورت بھی چنداں پسند نہ آئی۔ اور میں کوئی اس سے بھی سہل ترکیب سوچنے لگا۔ اسی غور و تفکر میں نہ معلوم کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ یا یوں کہئے کہ میرا دم نکلا۔ میں نے رات بھر طرح طرح کے خواب دیکھے۔ کبھی پھانسی کے پھندے میں گلا ڈالا تو کبھی زہر ہلاہل کی شیشہ لگی۔ مگر میری موت نہ آنی تھی نہ آئی۔

صبح سویرے مرغ کی ککڑوں کوں، کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں اٹھ بیٹھا جیب کی گھڑی پر نظر پڑی۔ دیکھا تو وہ بند ہے میں نے اپنے قلب پر ہاتھ رکھا۔ مگر وہ بدستور چل رہا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے، ٹپ ٹپ، گرے میں نے سوچا کاش اس گھڑی کی رفتار کی طرح میرے دل کی رفتار بھی بند ہو گئی ہوتی۔



چچا بہار اُردو اکیڈمی میں

چچا، بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ چسکی لگا رہے تھے۔ اس درمیان کچھ سوچ کر چچا نے کلّن مرزا سے پوچھا ــ اے یار مرزا ـ یہ بہار اردو اکیڈمی ہے کیا۔ میں اپنے بھتیجے کی زبانی اکثر یہ نام سنا کرتا ہوں ـ

حد ہوگئی واللہ" کلّن مرزا بولے " تمہیں بھی خبر نہیں کہ بہار اُردو اکیڈمی کس چڑیا کا نام ہے ـ یہ تو غنیمت ہے کہ تم نے مجھ سے پوچھا۔ کسی اور سے پوچھتے تو احمق ہی سمجھتا تم کو ـ

احمق کیوں سمجھتا بھلا ــ چچا بولے " جب نہیں جانتا ہوں تب ہی تو پوچھ رہا ہوں تم سے ـ

تو بس ـ موٹا موٹی یہ جان لو ـ چھٹن مرزا بولے ـ بہار اردو اکیڈمی ایک ایسا ادارہ ہے جو اُردو کے سلسلے میں بہت سارے مفید کام انجام دے رہا ہے ـ اس سے زیادہ تم سمجھ بھی نہیں سکتے ـ

" مگر یار ـ اُردو اکیڈمی ہے کہاں " چچا نے دوسرا سوال کیا ـ

" استغفر اللہ " کلّن مرزا کلبلائے " یہ چند روز قبل جو ہم لوگ اردو لائبریری گئے تھے طلسم ہوشربا لانے، تو کیا تم آنکھیں بند کئے ہوئے تھے جو لائبریری کے بغل والی شاندار عمارت تمہیں نظر ہی نہ آئی ـ

" اچھا اچھا ـ " چچا ذہن پر زور ڈال کر بولے ـ " بہار اردو اکیڈمی وہی ہے گویا ـ تب تو یار ـ ایک دن ہم چاروں وہاں کی سیر کر آئیں ـ اور اگر ممکن ہوا تو ببّو کی امّاں کو بھی کسی دن

پردے کے اہتمام کے ساتھ بہار اردو اکیڈمی کی سیر کرا دوں۔

دماغ ہی خراب ہو گیا ہو تو اس کا کیا علاج۔ ہینگن مرزا غرائے۔ یہ بہار اردو اکیڈمی کوئی چڑیا گھر ہے کیا جو بنّو کی امّاں کو لے جا کر دکھلاؤ گے۔

"اماں یار مرزا" چچا مسکرائے۔ یہ تو یوں ہی تفریحاً کہا تھا۔ ورنہ میں ایسا گدھا تھوڑا ہی ہوں کہ پرانا ڈھول گلے میں لٹکائے پھروں..... ہی ہی ہی.... تو بناؤ بہار اردو اکیڈمی چلنے کا پروگرام۔

پروگرام کیا بنانا ہے۔ تینوں افیونی ایک زبان ہو کر بولے" کل ہی صبح سویرے چل چلیں ہم لوگ۔

چچی کو جب چچا کے پروگرام کی خبر ملی تو انھوں نے رات ہی کو کلچہ بنا کر تیار کر دیا۔ صبح سویرے جب چچا کے تینوں دوست آ گئے تو بدھوا ملازم چوراہے سے ٹم ٹم لے آیا۔ چچا اکڑتے ہوئے حویلی سے باہر نکلے۔ چچا چست پاجامہ انگا اور سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر کج چپی ٹوپی۔ کندھے پر مکہ شریف کا رومال اور بازو پر امام ضامن بندھے تھے۔

چچا دوستوں کے ساتھ ٹم ٹم پر سوار ہو گئے تو چچی کلچہ کی تھیلی۔ پن بیا اور صراحی بدھوا کے حوالہ کر کے بولیں" بیٹھ جا تو بھی ٹم ٹم پہ۔ اور دیکھ راستے میں تھوڑی تھوڑی دیر پر میر صاحب کو کلچہ کھلا کر پن بیا سے پانی پلاتے رہیو"

ٹم ٹم چل پڑی۔ شاہ گنج سے چوہٹّی کی دوری ہی کتنی ہے۔ بات کی بات میں راستہ طے ہو گیا۔ بدھوا غریب راستہ میں چچا کو کلچہ بھی نہ کھلا سکا۔ البتہ بہار اردو اکیڈمی کے کمپاؤنڈ میں جب ٹم ٹم رکی تو چچا نے دو تین کلچہ تھیلی سے نکال کر کھایا اور پن بیا سے پانی پی کر ٹم ٹم سے کود پڑے۔

اندر قدم رکھتے ہی چچا کی نظر اکیڈمی کے سیلز سنٹر پر پڑی۔ قریب جا کر چچا نے پوچھا۔ اجی بابو۔ داستان امیر حمزہ طلسم ہوشربا اور افیون کے فوائد سے متعلق بھی کتابیں مل سکتی ہیں یہاں" لیکن جب نفی میں جواب ملا تو چچا جھنجھلا کر بولے۔ یہ کیسا سیلز سنٹر ہے

صاحب کے افیون سے ذوق رکھنے والوں کیلئے ایک کتاب بھی یہاں نہیں۔ اچھا تمانشہ ہے یہ ....اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر۔ (اشارہ کر کے) وہ سامنے والے ہال میں کیا فروخت ہوتا ہے ذرا وہاں کچھ فروخت تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ چھٹن مرزا نے جواب دیا۔ وہ تو شعبۂ خطاطی ہے جہاں کتابت کرنی سکھائی جاتی ہے۔

"خوب خوب" چچا چہکے۔ تب تو بہت مفید اور کارآمد ہنر سکھایا جاتا ہے (سرگوشی کے انداز میں)..... یار مرزا کیوں نہیں ہم لوگ بھی کتابت سیکھنے کے لئے اپنا داخلہ کرالیں۔ یہ ہنر سیکھ لیا تو گھر بیٹھے افیون کے لئے پیسے نکل آئیں گے۔

کیا کہتے ہیں واللہ۔ چھٹن مرزا نے پھٹکارا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہیں اور چلے ہیں کتابت سیکھنے۔

چچا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں پہنچے۔ اور چاروں طرف گردن گھما گھما کر دیکھنے کے بعد بولے۔ واقعی مرزا بڑی شاندار عمارت ہے۔ سب دریا ہونے کے باعث بہت ہی پر فضا بھی ہے کچھ دنوں یہاں رہ جاؤں تو واللہ بہت بن جائے۔

چچا کو جب معلوم ہوا کہ منتخب کتابوں کی طباعت کے مالی تعاون کے علاوہ انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے تو چچا خوش ہو کر بولے۔ "یار۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ افیون کے فوائد پر ایک کتاب لکھوں اور اکیڈمی کی مالی تعاون سے چھپوا کر انعام بھی حاصل کروں ؏

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

اکیڈمی کے ہر شعبہ میں گھومتے ہوئے چچا کتابت خانہ میں پہنچے۔ وہاں کاتبوں کی چوکیوں پر تکیہ کے سہارے کتابت کرتے دیکھ کر بولے۔ دیکھتے ہو یار۔ اس طرح بیٹھ کر کام کرنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب جی چاہا لیٹ کر کمر سیدھی کر لی۔ یہ کہہ کر چچا بھی دراز ہو کر ایک چوکی کے سر کے نیچے تکیہ رکھ جو لیٹے تو خراٹے بھرنے لگے۔ گھنٹوں بعد جب نیند ٹوٹی تو افیون کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چچا اور ان کے ساتھیوں نے جیب سے افیون کی ڈبیہ نکالی اور چسکی لگانے میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ عالم سرور میں غوطہ لگانے لگا ایک دوسرے پر ڈھیر ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

--- ❖ ---

ہاشم عظیم آبادی

ایک کنوارے کی دعا

بدرگاہِ قاضی الحاجات

اے میرے خدا مجھ کو گھر ایسے سسر کا دے
اک اچھی سی سروس جو پہلے مجھے دلوا دے

رشوت کے ملیں پیسے کچھ اتنے ڈھیرے سے
جو میرے مقدر کے ہر ذرے کو چمکا دے

ہو دل کا غنی ایسا وہ میرا سسر یا رب
جو عقد کے پہلے ہی ٹی وی مجھے بھجوا دے

بیوی کے علاوہ جو مجھ پہ سے نچھاور ہو
اک ایسی بھی سالی دے اک ایسا بھی سالا دے

بخشی ہے مجھے تو نے ویسے تو کئی مرغی
اک ایسی مرغی دے جو سونے کا انڈا دے

ہمدوش ہوں برلا کے ٹاٹا کے برابر ہوں
کچھ اتنی بلندی پر مولا ہمیں پہنچا دے

لیڈر کی طرح یا رب سسرال میں رہتا ہو
دن کو ہو اگر پوری تو رات کو مرغا دے

ہاشم کی طرح مولا ہر ایک کنوارے کو
تو اپنی عنایت سے قارون کا خزانہ دے

پروگرام

ہاشم سے ملاقات کے خواہاں ہوں اگر آپ
وہ صبح کو پڑھتا ہوا اخبار ملے گا
اور دس بجے جب جاتی ہیں کالج کو خواتین
تکتا ہوا اُن کو سرِ بازار ملے گا
اور بارہ بجے وقت ہے قیلولہ کا اُس کے
وہ کروٹیں لیتا ہوا ہر بار ملے گا
اور چار بجے پاس کے ہوٹل میں پہنچ کر
یاروں کو سناتا ہوا اشعار ملے گا
اور شام کو دیکھو تو کتب خانہ میں بیٹھا
گرد اُس کے کتابوں کا اک انبار ملے گا
اور رات کو نو دس بجے گھر آنے پہ واپس
بستر پہ پڑا نیند سے سرشار ملے گا
اور بارہ بجے شب میں ہو جب غلبۂ اشعار
بستر ہی پہ لکھتا وہ قلم کار ملے گا
القصّہ وہ مشغول رہا کرتا ہے ہر دم
شاید ہی کبھی آپ کو بے کار ملے گا
اور ہو کسی باعث جو طبیعت پہ گرانی
خود اپنی ہی صورت سے وہ بیزار ملے گا

٭٭٭